# سورۃ فاتحہ

## نام:۔

اس سورت شریفہ کا سب سے مشہور نام اَلْفَاتِحَۃُ یا فَاتِحَۃُ الْکِتَابِ ہے۔سورتوں کے اسماء جن سے وہ مشہور ہیں، بہت سے صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں اور خود نبی کریم ﷺ کی زبان سے مروی ہیں۔

## سورتوں کے نام توقیفی ہیں:۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے اسماء توقیفی ہیں، یعنی خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے منجانب اللہ ہیں۔ چنانچہ اس سورت کا نام اَلْفَاتِحَۃُ یا فَاتِحَۃُ الْکِتَابِ بھی حدیث میں مروی ہے۔

## فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی:۔

جیسا کہ ابوداوٗد اور ترمذی کی اس حدیث سے ثابت ہے، جس میں فرمایا: [لَا صَلٰوۃَ إِلَّا بِقِرَآءَۃِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ] (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلاَتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ: 820) یعنی ''فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔'' اور بھی کئی حدیثوں میں یہ نام آتا ہے، مثلاً صحیحین میں عبادہ بن صامت کی روایت سے ہے: [قال رسول اللہ ﷺ: "لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ".] (صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ وَمَا يُجْهَرُ فِيهَا وَمَا يُخَافَتُ: 756) ''جو شخص فَاتِحَۃُ الْکِتَاب نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔''

## فاتحہ کے اور نام:۔

خود قرآن شریف میں سورۃ الحجر میں اس کا نام ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ﴾ آیا ہے یعنی ''سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔'' اور حدیث صحیح میں اس کا نام أُمُّ الْقُرْآن یا أُمُّ الْکِتَاب بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، اور نام بھی وارد ہیں، جیسے: اَلدُّعَآء، اَلصَّلٰوۃُ، اَلشِّفَآءُ، اَلْکَنْزُ، اَلْحَمْدُ۔ امام سیوطی نے پچیس نام اتقان میں لکھے ہیں۔

## خلاصۂ مضمون:۔

### اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی چار صفات:

اس سورت میں کل سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کاملہ کا ذکر ہے جن پر اس دنیا کا کل نظام قائم ہے۔

### ربوبیت:۔

یعنی پہلی آیت میں ربوبیت یا وہ صفت جو ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔

**رحمانیت:۔**

دوسری آیت میں رحمانیت یا وہ صفت جو ہر شے کے اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری اسباب اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے مہیا فرماتی ہے۔

**رحیمیت:۔**

یعنی وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر اعلیٰ درجہ کے ثمرات مرتب فرماتی ہے۔

**مالکیت:۔**

اور تیسری آیت میں مالکیت یا وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر یا قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دیتی ہے تاکہ نظام عالم قائم رہے اور چیزیں اپنے کمال کو پہنچتی رہیں۔ چوتھی آیت میں بندہ کا یہ اقرار ہے کہ صرف وہی ذات پاک جس کی محامد پہلی تین آیات میں مذکور ہیں لائق عبادت ہے اور صرف اسی سے ہر قسم کی مدد طلب کی جاتی ہے۔

**فاتحہ کے دو حصے اور ان کا باہم تعلق:۔**

آخری تین آیات میں راہ راست پر چلنے اور تفریط وافراط سے بچنے کی دعا ہے۔ پس پہلی تین آیات صرف محامد الٰہی کے لیے ہیں۔ آخری تین بندہ کے لیے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اور درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد کا تعلق ہے یعنی دونوں میں مشترک ہے اور اس سے پہلے حصہ یعنی ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' کا تعلق درحقیقت پہلی تین آیتوں سے ہے کیونکہ وہ کامل محامد جن کا ذکر ان آیات میں ہے اسے مستحق عبادت ٹھہراتی ہیں اور جب وہ مستحق عبادت ہوا تو اعانت کا طلب کرنا بھی اسی سے ضروری ہوا۔ اب اس پچھلے حصہ ﴿اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' کا تعلق پہلے حصہ سے قائم ہو گیا اور پھر اس استعانت کی تشریح آخری تین آیات میں فرمائی اور یوں اس کا تعلق آخری تین آیات سے ہو گیا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث کے جس کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے کہ صلوٰۃ یعنی فاتحہ مجھ میں اور میرے بندہ میں نصف نصف ہے: [قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ.] (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ: 821)

**فاتحہ کے ابتدا میں رکھا جانے کی وجہ اس کی عظمت ہے:۔**

صحیح احادیث میں اس کو [أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ] کہا گیا ہے یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت۔ اس کی عظمت اول تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے۔

**خلاصہ تعلیم قرآنی:۔**

پھر اس کا نام [أُمُّ الْكِتَاب] بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ قرآن کریم کی اصل غرض محامد الٰہی کا

بیان کرنا اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس سورت کے پہلے حصہ میں وہ محامد مذکور ہیں اور پچھلے حصہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔ پھر اس سورت کو ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب'' سے شروع کر کے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا، بلکہ نسل انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی اور ﴿ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کا لفظ استعمال فرما کر ساری تفریقات قومی کو دور کر دیا۔ اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوت کو قائم کرے اور ان الفاظ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب'' سے بہتر الفاظ میں یہ خلاصہ نہیں ہوسکتا۔

## فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید:۔

پھر اس سورت کے اندر جن صفات الٰہی کا ذکر ہے وہ گویا کل صفات الٰہی کے لیے بطور ام یا جڑ کے ہے۔ یعنی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت۔ انہی سے باقی صفات الٰہی بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے کہ مذاہب عالم کے کل اصول باطلہ کی ان میں تردید ہے۔ صفت ربوبیت میں اس بات کا رد ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہوسکتا ہے۔ وہ روح اور مادہ کا بھی رب ہے اس لیے روح اور مادہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہوسکتے۔ ایسا ہی بت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے۔ کیونکہ مستحق حمد و عبادت وہی ذات ہوسکتی ہے جو دوسروں کی ربوبیت کرے اور ربوبیت کرنیوالی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفت رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔ کفارہ کے عقیدہ کی تردید ہے کیونکہ کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد اس بات پر ہے اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس کا بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔ مگر رحمانیت چاہتی ہے کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو۔ جیسا کہ اس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ ان کے لیے سامان مہیا فرماتا ہے۔ صفت رحیمیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور اس لیے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ صفت مالکیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے ملک کے ساتھ ہے تناسخ وغیرہ عقائد کی تردید ہے۔ جن کی رو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کرسکتا اور اس لیے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار جونوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

## میانہ روی کی تعلیم:۔

اور جس طرح عقائد باطلہ کی تردید اس حصہ میں ہے۔ پچھلے حصہ میں ہر ایک قوم کی افراط و تفریط کی تردید ہے۔ سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخ اخلاق انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں اور اس لیے ان میں تفریط و افراط کی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یعنی ایک شاخ پر حد سے زیادہ زور دیا اور دوسری کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے جو ایک طرف تفریط سے بچاتا ہے اور دوسری طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔ پس یوں سورۂ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید بھی موجود ہے اور اس کے بالمقابل عقائد اور اعمال میں ان اصول حقہ کی تعلیم ہے جو

بطور بنیاد کے ہیں۔

## بہترین دعا:۔

پھر جو دعا اس سورت میں سکھائی گئی ہے وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔

## عیسائی دعا سے مقابلہ:۔

عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعویٰ ہے۔ مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں۔ وہاں روز کی روٹی کی التجا ہے۔ یہاں صراط مستقیم کی یعنی کمال انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہو اور نہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہو نہ افراط۔ گو یا یہ بے گناہ یا معصوم بن جانے کی دعا ہے۔ پس کامل اصول حقہ کے سکھانے میں اصول باطلہ کی تردید میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سکھانے میں اور کمال انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ تورات میں ملتی ہے نہ انجیل میں۔ ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' کے مختصر فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔

## بہترین وظیفہ:۔

جو لوگ وظائف کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں۔ اور یہ وہ وظیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے۔

## زمانۂ نزول:۔

نہ صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔

## ابتدائی وحی:۔

بلکہ اس پر بھی کہ مکی وحی میں بھی نہایت ابتدائی زمانہ کی ہے۔

## نماز باجماعت کی ابتدا:۔

یہ سورت ابتدا سے نماز میں پڑھی جاتی تھی اور نماز مکہ میں برابر پڑھی جاتی تھی۔ بلکہ بعثت نبوی کے چوتھے سال کا یہ واقعہ کہ سعد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ کے پاس ایک میدان میں نماز پڑھ رہے تھے جس پر کفار کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور اس کے بعد ارقم رضی اللہ عنہ کا گھر نماز پڑھنے کے لیے منتخب کیا گیا، بتاتا ہے کہ چوتھے سال سے پیشتر نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی اور اس لیے سورہ فاتحہ بھی پڑھی جاتی تھی۔ اس کے ابتدائی نزول کے متعلق صرف قیاس اور قرائن ہی نہیں۔

## نزول میں سب سے پہلی مکمل سورت:۔

بلکہ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ فاتحہ [أَوَّلُ شَيْءٍ أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ] (تفسیر الطبری: جلد: 21 صفحہ 521) ہے

یعنی سب سے پہلے جو چیز قرآن سے نازل ہوئی۔ اس حدیث کو بیہقی نے دَلَائِلُ النَّبُوَّۃ میں بیان کیا ہے۔ (ث) اس پر جرح یہ ہوئی ہے کہ بالاتفاق ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ﴾ [العلق: 1/96] ''اپنے رب کے نام سے پڑھ'' سب سے پہلے نازل ہوا ہے۔ مگر غالب مراد [أَوَّلُ شَيْءٍ] سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوری سورت جس کا نزول سب سے پہلے ہوا فاتحہ ہے کیونکہ سورہ علق کی صرف پانچ آیتیں صدر کی پہلے نازل ہوئیں اور بقیہ حصہ بعد میں نازل ہوا۔

## بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں :۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ قرآن کریم میں سوائے سورۂ براءت کی سب سورتوں کئے ابتدا میں لکھی جاتی ہے۔

## بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں :۔

اور اس کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورۃ کی علیحدگی کو نہیں پہچانتے تھے یہاں تک کہ آپؐ پر ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ نازل ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ البتہ یہ آیت قرآن کریم کی کسی سورۃ کی آیات کے اندر شمار نہیں ہوتی اور نہ ہی فاتحہ کے۔

## ہر سورت میں مستقل آیت ہے :۔

ابن کثیر میں ہے کہ داؤد نے کہا کہ ہر ایک سورۃ کی ابتدا میں یہ ایک مستقل آیت ہے۔ اس سورۃ میں سے نہیں اور یہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے روایت ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح مذہب ہے۔

## بسم اللہ ہر سورت کا خلاصہ ہے :۔

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کیوں ایک مستقل آیت ہے؟ اس لیے کہ جس طرح سورۃ فاتحہ خلاصہ ہے کل قرآن کریم کا۔ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ خلاصہ ہے سورہ فاتحہ کا اس لیے کل قرآن کریم کا بھی یہ خلاصہ ہے اور چونکہ قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ بجائے خود بھی ایک کتاب ہے کہ اس کے اندر ایک مستقل مضمون ہے۔ اس لیے ہر سورۃ کی ابتدا میں بھی اسے ایک مستقل آیت رکھا گیا ہے۔

## سورۂ فاتحہ کا خلاصہ :۔

اور سورہ فاتحہ کا اس کا خلاصہ ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ فاتحہ میں جن چار صفات الٰہی کا ذکر ہے ان میں سے یہاں دو کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یعنی وہاں ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کی صفات ہیں جو کل صفات الٰہی کے لیے بطور اُمّ کے ہیں۔ یہاں ان میں سے دو صفات رحمانیت اور رحیمیت کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔

## نظام عالم رحمانیت و رحیمیت پر ہے :۔

اور اگر غور کیا جائے تو سامانوں کا مہیا ہونا اور جب ان سامانوں کو کام میں لایا جائے تو اس پر اجر کا مرتب ہونا یہی سلسلہ نظام عالم ہے

جس پر کل کاروبار کا دارومدار ہے۔جس قدر سامان زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیئے ہیں جیسے ہوا، پانی، آگ، سورج وغیرہ ایسا ہی اس کے قوانین یہ سب کچھ صفت رحمانیت کا ظہور ہے اور جب ان چیزوں کو ہم اپنے کام میں لاتے ہیں تو ان سے نتائج کا پیدا ہونا صفت رحیمیت کا ظہور ہے۔

## نظام روحانی بھی رحمانیت و رحیمیت پر ہے:۔

پس ہماری جسمانی زندگی کے سلسلہ میں یہی دو صفات اصلی کام کرنے والی ہیں۔ یہی حالت ہماری روحانی بقا کی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ صفت رحمانیت کے تقاضا سے ہمیں اپنی طرف سے قانون اور شرائع انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے عطا فرماتا ہے: ﴿ اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ ﴾[الرحمٰن: 55/2-1] ''رحمٰن نے ،قرآن سکھایا'' اور جب ان شرائع اور قوانین کو ہم اپنے عمل میں لاتے ہیں تو ان پر نتائج مترتب فرماتا ہے۔ پس نظام جسمانی اور نظام روحانی دونوں کا قیام انہی دو صفات سے ہے۔

## اسم اعظم:۔

اس لیے بعض نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم [اَللّٰه .. الرَّحۡمٰن .. الرَّحِيۡم] قرار دیا ہے (زرقانی) اور نہ صرف صفات الٰہی کا ہی بسم اللہ میں خلاصہ آ گیا ہے بلکہ وہ نصف حصہ جو سورہ فاتحہ میں بندہ کے لیے ہے۔ اس کو یہاں ایک ''با'' سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ وہ حصہ ﴿ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ﴿۴﴾ ﴾ ''تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' سے شروع ہوتا ہے اور یہاں بھی ''با'' استعانت کے لیے ہے۔

## بسم اللہ میں عملی توحید:۔

یوں بسم اللہ ہر مسلمان کی زندگی میں عملی توحید کا سبق ہے۔

## بسم اللہ امر الٰہی کی تعمیل بھی ہے:

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴾ درحقیقت اس امر الٰہی کی بھی تعمیل ہے جو رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے ہوا۔ بخاری میں ہے کہ جب آپ غار حرا میں حسب معمول عبادت الٰہی میں مصروف تھے تو فرشتہ آیا اور کہا: [اِقۡرَاۡ] یعنی پڑھ۔ آپ نے کہا [مَا أَنَا بِقَارِئٍ] میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ فرشتہ نے پھر وہی لفظ دہرائے اور آپ نے بھی جواب کا اعادہ کیا اور اسی طرح تین مرتبہ ہوا۔ چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا ﴿ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ ...الخ ﴾[العلق: 1:96] ''اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا'' تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو سکھایا کہ (بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ) کس طرح پڑھا جاتا ہے۔

## بسم اللہ کی ابتدا:۔

چنانچہ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دوسری وحی جو نازل ہوئی تھی وہ یہی تھی ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۱﴾ ﴾ ''اللہ بے انتہا رحم والے، بار بار رحم کرنے والے کے نام سے، سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب'' سورت کے آخر تک۔ گویا اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو تعلیم دی کہ وہ خدا کی مدد کس طرح طلب کیا کرے؟

اٰیَاتُھَا 7 | (1) سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ (5) | رُکُوْعَاتُھَا 1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔(1)

---

**بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے:۔**

اور ایک حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ یوں ہے:[كُلُّ أَمْرٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ أَجْذَمُ](تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 120) یعنی ہر ایک کام جسے ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے اور یقیناً جو شخص اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے استعانت کا طالب ہوگا اسے برکت ملے گی۔

1- با: بسم اللہ میں با استعانت کے لیے ہے یعنی اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوا پڑھتا ہوں۔اور یہ ﴿اِقْرَاْ﴾[العلق: 1:96] کی تعمیل ہے۔

**اسم:۔**

[سِم، سِمْوٌ وَسُمُوٌّ] سے ہے جس کے معنی بلندی ہیں۔پس اسم وہ ہے جس سے مسمی کا ذکر بلند ہو اور وہ اس سے پہچانا جائے۔(غ) جوہر اور غرض یا ذات وصفات دونوں پر اس کا استعمال ہے۔اللہ اسم ذات ہے اور ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ صفاتی نام ہیں۔گویا پڑھنے والا اللہ کی صفات رحمانیت ورحیمیت کی مدد چاہتا ہے۔

**اللہ اسم اعظم:۔**

اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور کل اسمائے الٰہی کے لیے یہ اسم جامع ہے۔یہ [أَلَہَ] سے مشتق نہیں نہ اس کا اصل [إِلٰہ ] ہے کیونکہ [إِلٰہ ] غیر اللہ معبود پر بولا جاتا ہے۔حالانکہ اللہ کا لفظ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کبھی دوسرے معبود پر بولا گیا ہے۔نہ یہ [اَلْإِلٰہُ] کا مخفف ہے کیونکہ [یَا اَللّٰہُ] کہا جاتا ہے [یَااَلْإِلٰہُ] یا [یَا اَلرَّحْمٰنُ] نہیں کہا جاتا۔پس [ال] اس میں زائد نہیں۔عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم ذات موجود نہیں۔

**﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق:۔**

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ ''بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے'' دونوں [رَحِمَ] سے مشتق مبالغہ کے صیغے ہیں۔ایک فعلان کے وزن پر دوسرا فعیل کے۔فعلان کا مبالغہ امتلا اور غلبہ کے لیے ہوتا ہے۔یعنی صفت کی زیادتی کے لیے۔فعیل کا مبالغہ تکرار کے لحاظ سے ہوتا ہے یعنی صفت کے بار بار تکرار سے۔(ح) اور بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ رحمن کا لفظ اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے اور رحیم اس صفت پر جو اس شخص کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس پر رحم کیا گیا۔پس رحمان وہ ذات ہے جس کا رحم بہت ہی بڑا ہے۔یہاں تک کہ انسان کی پیدائش سے پہلے وہ انسان کے لیے سامان مہیا کرتا ہے اور یہ صفت مومن اور کافر دونوں پر حاوی ہے اور رحیم وہ ذات ہے جس کا رحم بار بار عود کرتا ہے اور یہ صفت اس شخص کے فعل پر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب(2)

---

ظہور پذیر ہوتی ہے (اور ہر فعل پر بار بار ظہور پذیر ہوتی ہے) جس پر رحم کیا گیا۔

**رحمان دنیا۔ رحیم آخرت:۔**

اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کا رحمان اور آخرت کا رحیم۔ کیونکہ رحمن نے انسان کی پیدائش سے پہلے محض اپنے رحم سے اس کے لیے سارے سامان پیدا کیے اور رحیم انسان کے صالح اعمال پر جزا دینے والا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ گویا ابتدا میں جو سامان انسان کے لیے مہیا کرتا ہے وہ رحمن ہے اور ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر جب انسان کوشش صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ دینے والا رحیم ہے۔ زمین، پانی، آگ وغیرہ کا پیدا کرنا صفت رحمانیت کا تقاضا ہوا۔ زمین میں ہل چلا کر پانی دے کر انسان ایک دانہ کا سو بنالیتا ہے۔ یہ تقاضائے رحیمیت ہے۔ اسی طرح شرائع کا دینا، نبوت کا عطا کرنا صفت رحمانیت کا تقاضا ہے۔ ان شرائع پر عمل کر کے فلاح حاصل کرنا صفت رحیمیت کے ماتحت ہے۔ اسی لیے قرآن کا آنحضرت ﷺ کو سکھانا بھی الرحمن کا کام ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾ [الرحمن:55:1-2] ''رحمٰن نے قرآن سکھایا''

**رحمٰن غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا:۔**

رحمٰن اللہ سے مخصوص ہے غیر پر نہیں بولا جاتا۔ اور رحیم بولا جاتا ہے۔ ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [التوبة 9:128] ''مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔'' آنحضرت ﷺ کی نسبت فرمایا ہے۔

2- اَلْ حَمْدُ: ﴿اَلْحَمْدُ﴾ میں اَلْ استغراقی ہے یعنی سب محامد یا ہر جنس کی حمد مراد ہے۔ حمد وہ تعریف ہے جو فضیلت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہے۔

**حمد، مدح، شکر میں فرق:۔**

مدح وسیع ہے کیونکہ مدح اختیار سے بھی کی جاتی ہے اور تسخیر سے بھی اور شکر کسی خاص نعمت کے مقابل پر ہونے سے اور بھی محدود ہے۔ (غ)

**رب:۔**

اصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشو ونما دینا یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ (غ) اور اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ پس رب وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔ یہاں سے مسئلہ ارتقا کی بھی اصلیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی رو سے بھی ہر چیز تدریجاً اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ مطلق لفظ رب صرف ذات باری پر بولا جاتا ہے دوسرے کی طرف منسوب کر کے اوروں پر بھی بول سکتے ہیں۔ جیسے رب الدار گھر کا مالک۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول منقول ہے ﴿اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ﴾ [یوسف 12:42] ''میرا ذکر اپنے آقا کے پاس کرنا۔'' اس کی جمع ارباب آتی

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے

ہے ﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ﴾ [یوسف 39:12] ''کیا الگ الگ خداوند اچھے ہیں؟''

عالم:۔

﴿الْعٰلَمِيْنَ﴾ عَالَم کی جمع ہے جو علم سے مشتق ہے۔کل مخلوق یا موجودات کو عالم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ آلہ ہے جو صانع کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔مخلوق کی ہر قسم کو بھی عالم کہا جاتا ہے۔ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ عالم ہیں۔(ت) کل انسان بھی ایک عالم ہیں اور ہر ایک قوم بھی ایک عالم ہے۔ بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو بھی ایک عالم کہا جاتا ہے۔ (ج) اس لیے جہاں بعض انسانوں یا قوموں کو عالمین پر فضیلت دینے کا ذکر ہے وہاں مراد اس زمانہ کے لوگ ہیں۔ یہاں مراد جمع لانے سے موجودات کی سب اقسام کو شامل کرنا ہے۔

الحمد میں رضا بالقضا کا سبق:۔

اسلام کی تعلیم کی ابتدا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ سے ہوتی ہے جس میں انسان کو رضا بالقضا کا اعلیٰ سے اعلیٰ سبق سکھایا گیا ہے کیونکہ یہ وہ سورت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ نمازوں میں کئی کئی بار پڑھتا ہے اور راحت میں ہو یا تکلیف میں اس کے منہ سے حمد اور شکر کے کلمات ہی نکلتے ہیں۔

قلب نبوی کی وسعت:۔

اس سے نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک کی بھی کیفیت معلوم ہوتی ہے جس پر اس وحی کا نزول ہوا۔آپ کے دل میں اس قدر حمد الٰہی بھری ہوئی تھی کہ کسی حال میں خدا کی شکایت کا وہم بھی آپ کے دل میں نہ آسکتا تھا۔صبح اٹھتے ہیں تو حمد، دوپہر کو حمد، سہ پہر کو حمد، غروب آفتاب پر حمد، رات کو سوتے وقت حمد، رات کو اٹھ کر حمد۔آپ کا سینہ حمد الٰہی سے لبریز تھا۔

**احمد**:۔ اسی حمد کی وجہ سے جو آپ نے سب انبیاء سے بڑھ کر کی آپ کا نام احمد ہوا۔ جو آپ سے پہلے کسی انسان کا نام نہیں ہوا۔

**محمد**:۔ اور جب آپ نے سب سے بڑھ کر خالق کی حمد کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی مخلوق سے سب سے بڑھ کر آپ کی حمد کرائی اور اس لیے آپ کا نام محمد ﷺ ہوا۔

اسلام کی تعلیم کی وسعت پر یہ دلالت ہے کہ اس کی ابتدا ہی تمام جہانوں کی ربوبیت سے ہوتی ہے نہ ایک قوم کی۔

وحدت نسل انسانی:۔

اس ایک فقرہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴾ ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب۔'' میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، نسل انسانی کی وحدت بھی بیان کردی۔ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴾ کا لفظ اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر پہلے متفرق طور پر نسل انسانی کی روحانی ربوبیت ہوتی رہی تو اب ان سب کی ربوبیت ایک ہی نبی کے ذریعہ سے ہوگی۔ کیونکہ یہاں

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ جزا کے وقت کے مالک (کے لیے)۔(3)

رَبُّكُمْ یا رَبُّ الْمُسْلِمِيْنَ یا اور کوئی ایسا لفظ اختیار نہیں کیا، جس سے تفرقہ پیدا ہوتا۔

### ضرورت وحی:۔

پھر رب العالمین میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کیونکہ اسم رب کا تقاضا ہے کہ ہر مخلوق کو اپنے کمال کو پہنچائے مگر انسان کا حقیقی کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں بلکہ وہ اخلاق سے ہے۔ پس جس طرح جسم کے کمال کے لیے عالم جسمانی میں خارجی سامان رب نے پیدا کیے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال کو حاصل کرنے کے لیے خارجی سامان عالم روحانی میں موجود ہوں، یہی وحی الٰہی ہے۔ اسی چھوٹے سے فقرہ میں یہ عظیم الشان سبق بھی ہے کہ استحقاق حمد ربوبیت سے پیدا ہوتا ہے۔

### مخلوق کی خدمت کا سبق:۔

پس وہی انسان قابل حمد ہوگا جو دوسرے انسانوں کی خدمت گزاری کرے اور وہ بھی صرف اپنے عیال یا خاندان یا قوم کی نہیں بلکہ سب قوموں کی بلکہ انسانوں کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کی بھی۔

### ربّ اور اب:۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب نے خدا تعالیٰ کو اب یا باپ کر کے پکارا ہے۔ قرآن کریم نے دعاؤں میں لفظ رب اختیار کیا ہے۔ کیونکہ رب کا تعلق اپنی مخلوق سے اس سے بہت بڑھ کر ہے جو باپ کا تعلق بیٹے سے ہے۔

### دعاؤں میں رَبَّنَا کا استعمال:۔

قرآنی دعائیں عموماً رَبَّنَا سے شروع ہوتی ہیں۔ گویا ہر دعا کا مقصد انسانوں کا کمال حقیقی تک پہنچنا ہے۔ کیونکہ رب وہ ہے جو ہر شے کو اس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ مگر ''اب'' انسان کو اس کے کمال تک نہیں پہنچاتا پس خدا کو ''اب'' کر کے پکارنا بہت ادنیٰ مرتبہ ہے۔

3- مَالِكِ اور مَلِكِ یعنی بادشاہ میں فرق یہ ہے کہ ملک صرف بعض امور میں متصرف ہوتا ہے مالک اپنی ملک پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ کیونکہ حرف کے بڑھنے سے معنی میں قوت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا مَلِكِ کا لفظ صرف انسانوں کی سیاست کے لیے مخصوص ہے یعنی وہ جو جمہور میں امر ونہی کا تصرف رکھتا ہو جو ایک محدود تصرف ہے۔ [مَلِكُ النَّاسِ] کہا جاتا ہے اشیاء کا یا ﴿يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ کا ملک نہیں ہوگا مالک ہوگا۔

یوم سے عموماً مراد وہ وقت ہے جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔ لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدت ہوتی ہے خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت ہی زیادہ۔ (غ) چنانچہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝﴾ [الرحمن 29:55] ''ہر آن وہ ایک شان میں ہے۔'' میں یوم سے مراد ایک آن ہے اور ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝﴾ [المعارج: 4:70] ''ایک دن میں جس کا

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴿۴﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ (4)

---

اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔'' میں ایک یوم پچاس ہزار سال کا فرمایا۔

دین کے اصل معنی جزا ہیں۔ (غ) بخاری میں ہے [الدِّيْنُ الْجَزَاءُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ] (صحیح البخاري، كتاب التفسير، باب مَا جَاءَ فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ، وَسُمِّيَتْ أُمَّ الْكِتَابِ أَنَّهُ يُبْدَأُ بِكِتَابَتِهَا فِي الْمَصَاحِفِ) یعنی یہاں دین سے مراد نیکی بدی کا بدلہ ہے۔ بطور استعارہ دین کا استعمال شریعت پر ہوتا ہے۔ گویا شریعت کی تابعداری کا نام دین ہے۔

پس ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾﴾ کے معنی ہوئے جزا سزا کے وقت میں مالک۔ جزا و سزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

## جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے:۔

مگر ایک رنگ جزا و سزا کا اس عالم میں بھی جاری ہے اور قرآن کریم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کھلا کھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ نظر انسانی سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔

## مالکیت میں گناہوں کی معافی کی طرف اشارہ:۔

مالک کا لفظ بجائے ملک کے اس لیے اختیار فرمایا کہ ملک محض ایک محدود اختیارات کا حاکم ہے جو فریقین میں انصاف کے لیے مامور ہے وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن مالک کو اختیار ہے جسے چاہے معاف بھی کر دے اس میں کفارہ اور تناسخ کا ابطال ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی رو سے خدا گناہ کو معاف نہیں کر سکتا بلکہ سزا دینے کے لیے مجبور ہے۔ یہ عقیدہ کس قدر خلاف واقعات ہے کہ ایک نوکر کا آقا یا مالک جو حقیقت میں مالک نہیں اس کا گناہ معاف کر سکتا ہے۔ مگر خدا جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور اگر معافی کی خواہش انسان میں ہے تو خالق میں کیوں نہیں؟ جو صفت خالق میں نہ ہو وہ مخلوق میں نہیں ہو سکتی۔

4- ﴿نَعْبُدُ﴾ عَبُوْدِيَةِ اظہار تذلل کا نام ہے اور عِبَادَةٌ اس سے بلیغ تر ہے یعنی انتہا درجہ کے تذلل اور انکساری کا نام ہے اور اس کا حقدار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی فضیلت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہو یعنی اللہ تعالیٰ جس کے سوائے دوسرے کی عبادت جائز نہیں۔ (غ) یا عبادت وہ طاعت ہے جس کے ساتھ خضوع یعنی عاجزی ہو۔ (ت) پس عبادت اصل میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری عاجزی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دے۔

## عبادت مقصد زندگی ہے:۔

عبادت کو انسان کی زندگی کی غرض فرمایا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ [الذاريات: 56:51] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' کیونکہ انسان اپنے کمال کو نہیں پا سکتا جب تک کہ اپنے

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ (5)

---

قویٰ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں نہ لگا دے۔ عبادت انسان کی اپنی بہتری کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے اس کو نہ کسی کی عبادت سے فائدہ پہنچتا ہے نہ عدم عبادت سے نقصان۔ نَسْتَعِیْنُ۔ اِسْتِعَانَۃٌ کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد چاہنا۔

### عبادت استعانت پر مقدم ہے:۔

جب اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ذکر ہوا تو انسان بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ ہم اپنی طاقتوں کو ایسی ذات کی کامل فرمانبرداری میں لگاتے ہیں اور اس کے سوائے کسی دوسرے کی عاجزانہ فرمانبرداری اختیار نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی انسانی روح اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہوئی پکارتی ہے کہ اے خدا منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے تیری ہی مدد بکار ہے۔ تو ہماری کمزوریوں کی اصلاح فرما اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم کو منزل مقصود تک پہنچا۔ فطرت انسانی میں عبادت کی استعداد موجود ہونے پر ہم ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتے ہیں اور عملاً محتاج اعانت ہونے پر ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کی خواہش موجزن ہوتی ہے جب تک انسان عبادت نہیں کرتا، اپنے قوائے فطری کو کام میں نہیں لگاتا اس وقت تک وہ مدد کا مستحق بھی نہیں ہوتا۔

5- ﴿اِھْدِنَا﴾ هِدَایَةٌ کے معنی ہیں [اَلرِّشَادُ وَالدَّلَالَةُ بِلُطْفٍ اِلیٰ مَا یُوْصِلُ إِلَی الْمَطْلُوْبِ.](ت) یعنی لطف کے ساتھ لے جانا اور رہنمائی کرنا اس کی طرف جو مطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچا دے۔

### ہدایت چار طرح پر ہے:۔

امام راغب رحمہ اللہ نے ہدایت کو چار طرح پر بیان کیا ہے۔ اول فطری ہدایت ہے جو عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خلق کے ساتھ ہی دے دی ہے۔ ﴿اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝﴾ [طٰہٰ 50:20] ''ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی) راہ دکھائی۔'' یا فرمایا: ﴿وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝﴾ [الأعلیٰ 3:87] ''جس نے (حدکا) اندازہ لگایا پھر راہ دکھائی۔'' یہ ہر چیز کی فطرت میں موجود ہے۔ دوسری وہ ہدایت ہے جو انسانوں کو نبیوں کے ذریعہ سے ملتی ہے۔ یعنی انبیاء کی دعوت الی الحق۔ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ [السجدة 24:32] ''اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔'' انبیاء ایک راستہ دکھا دیتے ہیں۔ ﴿اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ [الدھر 3:76] ''ہم نے اسے رستہ دکھایا ہے چاہے وہ شکرگزار ہے اور چاہے ناشکرا۔'' تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا گیا۔ یہ سب انسانوں کے لیے عام ہے جس کے لحاظ سے قرآن شریف کو ﴿هُدًی لِّلنَّاسِ﴾ فرمایا [البقرة: 185:2] ''لوگوں کے لیے ہدایت۔'' ﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی﴾ [محمد: 17:47] ''اور جو ہدایت اختیار کرتے ہیں، وہ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔'' ﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ [التغابن 11:64] ''اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔'' چوتھی ہدایت جنت ہے (یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا) جیسے ﴿سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝﴾ [محمد: 5:47] ''انہیں منزل مقصود پر پہنچائے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔'' یا جیسے یہاں یا ﴿هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ میں جیسا کہ تاج العروس سے شروع میں حوالہ دیا گیا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ اُن لوگوں کے رستے (پر) جن پر تُو نے انعام کیا(6)

---

﴿الْمُسْتَقِیْمَ﴾ وہ راہ ہے جو ایک سیدھے اور ہموار خط پر ہو اور اس سے طریق حق کو تشبیہ دی گئی ہے۔ (غ)

**دعائے فاتحہ کا مقصد:۔**

معترض کہتا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرنے والے کو تا حال گمراہ ثابت کرتی ہے اس نے پہلے الفاظ پر غور نہ کیا۔ یہ دعا کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو پہچان چکا۔ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہہ کر اپنے قویٰ کو خدا کی کامل فرمانبرداری میں لگا چکا۔ ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کے ذریعہ اپنی کمزوری کو دور کرنے کی مدد اللہ سے طلب کر چکا۔ ﴿وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾﴾ [یٰسٓ: 61:36] میری عبادت کرو یہ صراط مستقیم ہے۔ پس ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہنے والا صراط مستقیم پر تو ہے اس لیے ان الفاظ میں اس راہ پر قائم رہنے کی دعا مانگتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ اسی راہ پر چلتا رکھے اور راہ کو پا لینے کے بعد اس کا قدم نہ ڈگمگائے اور نہ سست ہو۔ یہاں تک کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے جیسا کہ ہدایت کے معنی سے ظاہر ہے۔ اصل مقصد اس دعا کا اس اعلیٰ منزل پر پہنچنا ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور جس کی طرف ایک طرف ﴿رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور دوسری طرف اِهْدِنَا میں اشارہ ہے۔ یعنی کمال انسانی کا معراج۔ پس اصل مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر چلاتے رہیو، یہاں تک کہ ہم اس کمال کو حاصل کر لیں جو انسان کی ترقی کی اصل منزل مقصود ہے۔

**مقام عصمت سے اوپر کمال انسانی کا حصول ہے:۔**

اس دعا میں انسان کے سامنے وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر وہ پہنچ سکتا ہے اور مذہب تو صرف گناہوں کی معافی کی دعا سکھانے تک رہ گئے۔ اسلام نہ صرف گناہوں سے بچنے، لغزشوں سے محفوظ رہنے اور یوں مقام عصمت یا محفوظیت پر پہنچنے کی دعا سکھاتا ہے بلکہ اس سے بھی بہت آگے کمال انسانی پر پہنچنے کی یہ دعا ہے جس کے برابر کوئی دعا کسی آسمانی کتاب میں نہیں۔ بلکہ خود قرآن شریف کی دعاؤں میں بھی یہ دعا سب سے افضل ہے۔

6- اِنْعَام کے معنی ہیں انسان کو احسان پہنچانا۔ غیر ناطق پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا۔ (غ)

**منعم علیہم کون ہیں:۔**

﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ سے کون مراد ہیں؟ قرآن کریم خود تشریح فرماتا ہے ﴿الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ﴾ [النسآء: 69:4] ''جن پر اللہ نے انعام کیا (یعنی) نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں (کے ساتھ)۔'' یعنی وہ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لے کر تمام مفسرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ﴿اِهْدِنَا﴾ کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے۔ جہاں نبی، صدیق، شہید، صالح پہنچے وہیں ہر مسلم پہنچنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعا میں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔

### اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے:۔

یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو، بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الٰہی پہنچے۔یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجالانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا روپیہ، مال، مرتبہ کے ملنے کے لیے نہیں۔ کمالات، معرفت، محبت کے حصول کے لیے ہے۔

### ﴿اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ﴾ مقام نبوت کی دعا نہیں:۔

یہاں نبی کا لفظ آ جانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقام نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے۔اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقام نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔

### نبوت موہبت ہے:۔

اس لیے کہ نبوت محض موہبت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ ایک وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اول میں سے ہے۔جیسا کہ ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ [الرحمن:55:2-1] ’’رحمٰن نے قرآن سکھایا‘‘ سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کرے اور دعائیں مانگ مانگ کر اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنا نہ آئندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ ﴿اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ﴾ [الانعام: 6:124] ’’اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنے رسالت کو رکھے۔‘‘ کے ماتحت جب چاہتا ہے کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت ﷺ پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لیے مقام نبوت و رسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو النبی اور الرسول کے نام سے پکار کر بتا دیا کہ اب دوسرا نبی اور رسول نہیں ہوگا کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آ جائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہو جائیں۔ پس مقام نبوت کے لیے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے۔اور اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے۔

### کن کمالات کی دعا ہے:۔

ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصول بادشاہت کی دعا ہے۔ کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام قرار دیا ہے۔[المآئدۃ 5:20] اور بعض نے اسے اور بھی وسیع کر کے دنیا کے تمام امور میں صراط مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ بے شک بادشاہت ایک انعام ہے۔ مال و دولت بھی ایک انعام ہے۔مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک و بد شریک ہیں۔ بادشاہت ایک انعام ہے مگر ہر ایک بادشاہ منعم علیہ نہیں۔ دولت ایک انعام ہے مگر ہر ایک دولت مند منعم علیہ نہیں۔اور یہاں منعم علیھم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔ پھر منعم علیھم کے مقابلہ پر مغضوب علیھم اور ضالین ہیں جو دولت اور بادشاہت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سرانجام دینے سے محروم ہیں۔ بلکہ نیکی سے محروم ہیں، اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ دعا صرف اس قدر ہے کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہی راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انبیاء، شہداء، صلحاء کے نقش قدم پر چلا۔اس دعا کے

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ۷ نہ اُن کے جن پر غضب ہوا(7) اور نہ گمراہوں کے۔ (7اَ)

مقابل پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے۔

### اگر دعا سے حصول نبوت ہے تو امت کی محرومی لازم آتی ہے:۔

اگر یہ دعا نبوت کے حاصل کرنے کے لیے ہوتی تو کم از کم آنحضرت ﷺ کو ہی مقام نبوت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔ مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت کے ملنے کے بعد سکھائی گئی۔ نبوت عطا فرما کر اس دعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لیے یہ دعا نہیں اور اگر حصول نبوت کی دعا مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ مقربین اور محبوبین الٰہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گزرے۔ خدا خود دعا سکھائے اس کی غرض یہ ہو کہ دعا مانگنے والے کو نبوت ملے، دعا کرنے والی امت کو ﴿خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ [آل عمران 110:3] ''سب سے اچھی جماعت ہو۔'' کہا جائے اور پھر تیرہ سو سال سب کے سب محروم رہیں حتی کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [المائدۃ 119:5] اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

7- ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ غضب کے اصل معنی ہیں سزا کے ارادہ سے خون کا جوش مارنا۔ (غ) اور حدیث میں غضب سے بچنے کی تاکید ہے اور اس کو قلب ابن آدم میں ایک انگارہ قرار دیا گیا ہے۔

### غضب الٰہی:۔

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اس لیے جب اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ بولا جائے تو جو حصہ جسم سے تعلق رکھتا ہے یعنی ثوران دم یا خون کا جوش مارنا۔ وہ مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف اصل غرض باقی رہ جاتی ہے جو ارادہ سزا ہے اور یہی حالت تمام الفاظ کی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ ان میں وہ حصہ جو جسم سے تعلق رکھتا ہے باقی نہیں رہتا۔ تفصیل کے لیے دیکھو نمبر [27] پس ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ وہ لوگ ہوئے جن کے متعلق ارادۂ الٰہی سزا کا ہوا۔

7اَ- ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ ضَالٌّ ضَلَالٌ سے اسم فاعل ہے اور اس کے عام معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا عمداً ہو یا سہواً۔ (غ) اور یہ ھدی کے مقابل پر ہے اس لیے اس کے معنی یوں بھی کیے گئے ہیں [سُلُوكُ طَرِيقٍ لَا يُوَصِّلُ إِلَى الْمَطْلُوبِ] (ت) ایسی راہ پر چلنا جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ پس ضالین وہ لوگ ہوئے جو سیدھی راہ سے ہٹ گئے یا ایسی راہ پر چل پڑے جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ ضلال اور اضلال کے اور معانی اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے۔

### مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں:۔

اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مغضوب علیہم یہود ہیں اور ضالین عیسائی۔ اور ایک حدیث میں جس کو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے یہی معنی آنحضرت ﷺ سے مروی ہیں۔ یہود کی صفات غالب جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہ ہیں کہ انہوں نے انبیاء کے بارہ میں تفریط کی راہ اختیار کی یعنی عموماً انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اور ان کے قتل کے درپے رہے اور شریعت کے احکام کی نافرمانی کی یعنی ان پر عمل نہ کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ذکر کے شروع میں ہی آتا ہے

﴿ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾﴾ [البقرۃ: 61:2] ''وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اس لیے کہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھتے تھے۔'' پس انبیاء علیہم السلام کا انکار و تکذیب اور احکام الٰہی کی نافرمانی یہ وہ تفریط کی راہیں ہیں جن کی وجہ سے یہود پر غضب الٰہی آیا۔ باوجودیکہ وہ پہلے ایک ایسی قوم تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔ اور مسلمان کو جب یہ دعا سکھائی گئی کہ اس کا قدم مغضوب علیہم کی راہ پر نہ پڑے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ ان تفریط کی راہوں سے بچے اور عیسائیوں کی صفات غالب جن کی وجہ سے وہ طریق مستقیم سے پھر گئے قرآن کریم میں غلو اور افراط بیان کی گئی ہیں یعنی ایک نبی کو خدا بنالینا جیسا کہ فرمایا: ﴿ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿۷۷﴾﴾ [المآئدۃ: 77:5] ''اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو گئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے رستے سے بھٹک گئے۔'' گویا اب مسلم کی دعا یوں ہوئی اے اللہ ہم کو سیدھا رستہ دکھا ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا اور ان لوگوں کے رستہ پر چلنے سے بچا جو بوجہ تفریط غضب الٰہی کے نیچے آئے اور ان کے بھی جو بوجہ افراط و غلو گمراہ ہو گئے۔ بالفاظ دیگر اس صراط مستقیم پر چلا جو تفریط و افراط سے، تکذیب و غلو سے پاک ہے۔ یہ معنی بر بنائے قرآن و حدیث ہیں۔

## حقوق میں تفریط و افراط:۔

مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تفریط و افراط تمام حقوق میں ہوسکتی ہے۔ اگر ایک نبی کا انکار تفریط اور اس کا خدا بنانا افراط ہے تو ہر ایک حق کا انکار یا اس کا ادا نہ کرنا تفریط ہے اور ہر ایک حق کو اپنے مرتبہ سے بڑھانا اور اس قدر اس پر زور دینا کہ دوسرے حقوق کی فروگزاشت کا موجب ہو جائے افراط ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ یہودی عملی رنگ میں نافرمان ہوئے یعنی شریعت کے مانتے ہوئے پھر اس پر عمل نہ کیا۔ اور عیسائی علمی رنگ میں بھٹک گئے کہ ایک انسان کو خدا بنالیا۔

## عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا:۔

پس یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ اے خدا ہم کو یہود کی سی عملی اور نصاریٰ کی سی علمی غلطیوں سے بچا۔ کیونکہ انسان اپنے کمال حقیقی کو نہیں پہنچتا۔ جب تک دونوں پہلو عمل اور علم کے صحیح نہ ہوں۔

## آمین:۔

سورۂ فاتحہ کے آخر پر آمین کا پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امام غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ کہے تو تم آمین کہو۔'' (بخاری) آمین اسم فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اِسۡتَجِبۡ یعنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما۔

# سورہ البقرہ

## نام:

اس سورت کا نام اَلْبَقَرَۃ اس تذکرہ سے لیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیئے جانے کے متعلق اس سورت کے آٹھویں رکوع میں کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورت میں خاص طور پر یہود یوں کا ذکر ہے اور یہود میں جن کو اللہ تعالیٰ ایک موحد قوم بنانا چاہتا تھا گائے کی پرستش کا مرض مصر میں رہ کر پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے گائے کے ذبح کا تذکرہ اس سورت کے اہم ترین مضامین میں سے ایک مضمون ہے۔

## خلاصہ مضمون:

اس سورت کا خلاصہ مضمون یہ بتایا ہے کہ مسلمان کس طرح ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ رکوع

1 سب سے پہلے ان اصول کا ذکر کیا جو اسلام کی بنیاد ہیں اور بتایا کہ جو ان پر عمل پیرا ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو ان کی پروانہ کریں گے دکھ اٹھائیں گے۔

2 پھر ایک اور گروہ (منافقین) کا ذکر کیا جو منہ سے تسلیم کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔

3 پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کیا اور اس سے اس کی توحید کے دلائل دیئے اور اس کی عبادت کو ضروری ٹھہرایا۔

4 پھر انسان کے کمال کا ذکر فرمایا اور اس کے کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی کہ بغیر نبوت کے وہ کمال حقیقی کو حاصل نہیں کر سکتا۔

5 کمال کے بعد گر جانے کے خطرہ سے ڈرایا۔ یہود کا ذکر کیا جو ایک منعم علیہ قوم تھی مگر بوجہ اپنی نافرمانیوں کے رد کی گئی اور ان کو بتایا کہ اب بھی اگر اس نبی کو مان لو جو تمہاری اپنی پیشگوئیوں کے مطابق آیا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں شوکت وعظمت دے گا۔

6 تا 9 پھر ان پر جو جو انعامات کیے اور جو جو نافرمانیاں انہوں نے کیں ان کا ذکر فرمایا اور ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا۔

10 پھر بنی اسرائیل کے میثاق اور ان کی خلاف ورزی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں۔

11 پھر بنی اسرائیل کے ان اعتراضوں کا ذکر کیا جو انہیں اسلام پر تھے اور ان کا جواب دیا کہ کیوں بنی اسرائیل میں سے یہ نبی نہیں آیا۔

12 پھر ان کے عداوت میں اور ترقی کر جانے اور آنحضرت ﷺ کے خلاف فری میسنوں والے منصوبوں کا ذکر کیا۔

13 پھر بتایا کہ اگر پہلی شرائع کو ہم نے منسوخ کیا ہے تو ان سے بہتر شریعت تم کو دے دی ہے اور بتایا ہے کہ نجات تو صرف اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق کے ساتھ احسان کرنے سے ملتی ہے نہ برائے نام کسی مذہب کا پیرو ہو جانے سے۔

14 پھر بتایا کہ تھوڑی بہت سچائی ہر مذہب میں ہے مگر اسلام کامل صداقتوں کا مجموعہ ہے۔

15 پھر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی سے اوپر چلو تو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی تو یہی وعدہ تھا کہ اس کی اولاد کو برکت دی جائے گی اور وہ اپنی اولاد کے ایک حصہ کو مکہ معظّمہ چھوڑ کر اور وہاں دعائیں کر کے اس میں یہ بتا گیا تھا کہ آخر رحمت الٰہی اس چشمہ سے پھوٹ کر تمام دنیا کو سیراب کرے گی اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔

16 پھر بتایا کہ اسی ابراہیمی مذہب پر یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط سے بچ کر یہ نبی کھڑا ہوا ہے۔

17و18 پھر بتایا کہ جب ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کی صداقت یوں ظاہر ہوئی تو یہ بھی ضروری تھا کہ اس نبی ﷺ کا قبلہ کعبہ قرار دیا جاتا اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا کہ یہ ایک قبلہ تمہارے اتحاد کا مرکز ہے۔

19 پھر بتایا کہ کامیابی کے لیے مسلمانوں کے مال وجان کی بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ ان اصولی باتوں کو طے کر کے اور

20 پھر خدا تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو دہرا کر

21 تا31 شریعت کی تفصیلات کی طرف رجوع کیا یہ دکھانے کے لیے کہ یہ شریعت تفصیلات میں بھی ویسی ہی باتیں یا ان سے بہتر باتیں بتاتی ہے جو یہود کی شریعت میں تھیں۔ چنانچہ غذاؤں کے حرام وحلال، قصاص، وصایا، روزوں، جنگ، حج، شراب، جوا، یتامیٰ، زن وشوئی کے تعلقات، طلاق، بیواؤں کا ذکر کر کے

32و33 پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا کہ جس طرح بنی اسرائیل ایک مردہ قوم تھی جہاد اور کوشش سے خدا نے اسے زندہ کر دیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی اب جہاد اور کوشش کرنا ضروری ہے۔

34 پھر خدا تعالیٰ کے حی وقیوم ہونے کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشے گا اور انہیں بڑی قوم بنائے گا۔ مگر ان کو ﴿اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ﴾ سے روکا۔

35 پھر بتایا کہ کیونکر وہ مردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعات کا ذکر کیا۔

36و37 پھر کھول کر بتایا کہ اصل جڑ ساری کامیابیوں کی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس وقت ایک ایک دانہ ڈالو گے تو کل کو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دانے تمہیں ملیں گے۔

37 پھر بتایا کہ قربانیاں کر کے جب دولت مند ہو جاؤ تو سود نہ کھانا کیونکہ سود خور قوم آخر تباہ ہو جاتی ہے اور اخلاق فاضلہ سے عاری رہتی ہے۔

39 ہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے حقوق کی خوب نگہداشت کیا کرو اور لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو۔

40 اور سب سے آخر سب رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کرکے بتایا کہ کامیابی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ کامل اطاعت نہ کرو اور اس کے ساتھ خدا سے دعائیں نہ مانگو اپنا زور بھی پورا لگاؤ۔ پھر خدا کے حضور بھی گرے رہو تو ہم کافروں کے مقابلہ میں تمہاری نصرت کریں گے۔

## سورۂ بقرہ کا تعلق سورۂ فاتحہ سے:

اس سورت کا تعلق ایک تو بلحاظ ترتیب سورہ فاتحہ سے ہے۔ چونکہ سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی تھی کہ ﴿اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴾ [الفاتحة 5:1] ''تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔'' تو اس کا ابتدا یوں فرمایا: ﴿ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴾ [البقرة 2:2] ''یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں، متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔'' گویا یہ اسی دعا کا جواب ہے اور بتایا کہ قرآن کریم وہ صراط مستقیم بتاتا ہے، اس سورت میں بتایا کہ ﴿ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ﴾ کا گروہ وہ ہے جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتا ہے جن کا ذکر صدر سورت میں ہے۔ ساتھ ہی ﴿الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ ﴾ [الفاتحة 7:1] ''نہ ان کے جن پر غضب ہوا۔'' یعنی یہود کا تذکرہ بالتفصیل اور ﴿الضَّآلِّیۡنَ ﴾ یعنی نصاریٰ کا مجملاً کیا۔

## سورۂ بقرہ کے ابتدا میں رکھے جانے کی وجوہات:

لیکن چونکہ سورۂ فاتحہ ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن شریف کی ابتدا اسی سورہ بقرہ سے ہوتی ہے اور یہی سچ ہے۔ چنانچہ یہاں شروع میں ہی اس پاک کتاب کی اغراض کو بیان فرمادیا ہے اور اکمل واتم طور پر وہ باتیں بتادیں ہیں جو ایک قوانین کا واضع بطور تمہید بیان کردیا کرتا ہے۔ کہ اول یہ اس خدائے علیم کی طرف سے ہے جو نہ صرف فطرت انسانی اور ضروریات بشری کو جاننے والا ہے بلکہ گزشتہ اور آئندہ کی تمام باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر یہ ایک کتاب ہے، پراگندہ الفاظ یا منتشر اوراق کا مجموعہ نہیں۔ پھر اس کی غرض ہدایت یا دنیا کو راہ راست پر لانا ہے۔

## اصول اسلام کی قبولیت اور انکار کے نتائج:

پھر وہ اصول بیان فرمادیئے ہیں جن پر چل کر انسان ہدایت کو پاسکتا ہے اور وہ کل پانچ اصول ہیں۔ تین عقائد کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب (اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان) اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان، اس پر جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی اور اس وحی پر جو آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر دنیا میں نازل ہوچکی اور آخرت یعنی اعمال کی جزا وسزا پر یقین۔ اور دو عمل کے رنگ میں صلوٰۃ یعنی نماز اور دعا جو حقوق اللہ کا خلاصہ ہے اور انفاق یعنی اپنی قوتوں اور مال کو مخلوق کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا جو حقوق العباد کا خلاصہ ہے۔ پھر اس کا آخری نتیجہ بتایا کہ وہ کامیاب اور بامراد ہونا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے رکوع میں بیان فرمادیا اور یہ سورت ابتدا کے لیے ایسی موزوں ہے کہ اگر اس کو اس جگہ سے ہٹادیا جائے تو دوسری کوئی سورت اس کی جگہ نہیں رکھی جاسکتی۔ کیونکہ اور کسی سورت کی ابتدا میں اس طرح اصول اسلامی کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ اس سے قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کا منجانب اللہ ہونا صاف ظاہر ہے۔

## زمانۂ نزول:

اس سورت کا نزول مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوا اور اس کا اکثر حصہ جنگ بدر سے پیشتر کا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سب سے پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بعض آیات کا نزول آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری حصہ کا ہے۔ اس کی خاص خاص آیات کو مکی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے۔

## مدنی سورتوں میں مکی آیات:

گو اس میں شک نہیں کہ بعض سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے مگر جب تک کوئی صریح اور بین شہادت نہ ہو مدنی سورتوں کی بعض آیات کو مکی اور پہلے کا نازل شدہ قرار دینا غلط طریق ہے۔ ہاں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ مکی سورتوں میں بعض آیات ایسی ہوں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں۔ مگر یہ بھی محض قیاس کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کوئی صاف اور واضح شہادت نہ ہو۔ پس جس طرح یہ غلط ہے کہ جو آیت ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ﴾ سے شروع ہوتی ہے وہ مکی ہے خواہ مدنی سورت میں ہو۔ اور جو ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے شروع ہوتی ہے وہ مدنی ہے خواہ مکی سورت میں ہو۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ جن آیات میں یہود و نصاریٰ کا ذکر یا توریت و انجیل کا نام ہو وہ ضرور مدنی ہیں خواہ مکی سورت میں ہوں۔

## اٰيَاتُهَا 286 (2) سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (87) رُكُوْعَاتُهَا 40

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے، بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ① میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔(8)

معانقة 1 ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔(9)متقیوں کے لیے

---

8- ﴿الٓمّٓ﴾ یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں **مقطعات** کہلاتے ہیں اور قرآن کریم کی 29 سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں۔ عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کیے جاتے۔ حالانکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔ یہ حروف الفاظ کے قائمقام ہیں اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے۔ آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا۔ چنانچہ اس مصرعہ میں [قُلْتُ لَهَا قِفِيْ. قَالَتْ قَافْ ] ق کے معنی قَدْ وَقَفْتُ ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔ اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا بلکہ سیاق وسباق سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اس لیے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حرف کے لیے گئے ہیں دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے الٓمّٓ کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتدا میں ہے۔ یعنی آل عمران جو البقرہ کے بعد آتی ہے اور [العنکبوت:29:29، الروم:30:30، لقمان:31:31، السجدہ: 32:32] جو چاروں مکی ہیں اور ترتیب قرآنی میں ایک جگہ ہیں۔ گویا کل چھ سورتوں کے شروع میں الٓمّٓ ہے۔

الٓمّٓ کے معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے [أَنَا اللّٰهُ أَعْلَمُ ] مروی ہیں۔ یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔

9- ﴿ذٰلِكَ﴾ یہ لفظ عموماً اشارہ بعید کے لیے آتا ہے مگر عظمت کے ظاہر کرنے کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ یہاں بلحاظ عظمت کتاب ہی بولا گیا ہے۔ دوسری جگہ هٰذَا کے لفظ سے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ جیسے ﴿هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ﴾ [الأنعام: 155:6 ] ''اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے برکت دی گئی ہے۔'' یا ﴿ذٰلِكَ﴾ سے اشارہ بعید کتاب موعود کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کا وعدہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا تھا۔ (ر)

﴿الْكِتٰبُ﴾ کتاب مصدر ہے جو کَتَبَ سے مشتق ہے۔ جس کے اصل معنی ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا جمع کرنا ہیں اور لکھنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ لکھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں اور کتاب اصل میں صحیفہ کا نام ہے مع اس کے جو اس میں لکھا گیا۔ (غ) اور کلام اللہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ گو وہ لکھی ہوئی ہو یا نہ۔ (غ) یہ لفظ قرآن شریف پر بھی بولا گیا ہے جیسے یہاں۔ کسی ایک سورت پر بھی پہلی شرائع پر بھی۔ ہر ایک نبی کی وحی پر بھی۔ جملہ انبیاء علیہم السلام کی وحی پر بحیثیت مجموعی بھی۔

﴿رَيْبَ﴾ وہ شک جس کے ساتھ تہمت ہو۔ (ت)

لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ ہدایت ہے۔ (10)

---

### نفی رَیۡب کا دعویٰ اور اس کی دلیل:

یہاں اس کتاب میں رَیۡب کی نفی کی ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے جس کی صداقت کے لیے آگے چل کر فرمایا: ﴿وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ﴾[23] اس سے کوئی مخالف آج تک عہدہ برا نہیں ہوسکا۔ اس لیے یہ دعویٰ سچا اور ثابت شدہ قرار پایا۔

10- ﴿ھُدًی﴾ یہاں بمعنی ہادی ہے یعنی ایسی راہ پر چلانے والی جو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ [دیکھو نمبر: 8]

﴿مُتَّقِیۡنَ﴾ مُتَّقِي۔ اِتَّقٰی سے اسم فاعل ہے اور اِتَّقٰی اصل میں اِوۡتَقٰی ہے جو وَقٰی یَقِیۡ سے باب افتعال ہے۔ اور مصدر وِقَایَۃ کے معنی ہیں: حَفۡظُ الشَّيۡءِ مِمَّا يُؤۡذِيۡهِ وَيَضُرُّهُ۔ (غ) ایک چیز کی حفاظت کرنا اس سے جو اس کو ایذا دے اور نقصان پہنچائے۔ اور تقویٰ کے اصل معنی ہیں: جَعۡلُ النَّفۡسِ فِيۡ وِقَايَةِ مِمَّا يُخَافُ۔ (غ) یعنی اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا جس کا خوف کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے معنی بعض وقت خوف بھی کر لیے جاتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں تقویٰ اپنے آپ کو گناہ میں پڑنے سے بچانا ہے۔ حِفۡظُ النَّفۡسِ عَمَّا يُؤۡثِمُ۔ (غ)

### متقی بروئے حدیث:

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ["لَا يَبۡلُغُ الۡعَبۡدُ أَنۡ يَكُونَ مِنَ الۡمُتَّقِينَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأۡسَ بِهِ حَذَرًا لِّمَا بِهِ الۡبَأۡسُ".] (جامع الترمذي، صفة القيامة، بَاب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ أَوَانِي الۡحَوۡضِ: 2451؛ سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى: 4215) یعنی متقی ہونے کو انسان نہیں پہنچتا جب تک کہ ان چیزوں سے بچنے کے لیے جن میں برائی ہے ان چیزوں کو بھی چھوڑ نہ دے جن میں برائی نہیں۔ اور ایک حدیث میں توقہ نفس کے متعلق آتا ہے جس کے معنی ابن اثیر نے یوں کیے ہیں کہ اپنے نفس کو ہلاکت کے لیے پیش مت کرو اور آفات سے اس کی نگہداشت کرو۔ تاج العروس میں ہے کہ تَوَقّٰی اور اِتَّقٰی کے ایک ہی معنی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ''تَقۡوَی اللهِ'' کیا چیز ہے؟ یا ''اِتَّقُوا اللّٰہَ'' سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ متقی وہی ہے جو تقوی اللہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ انسان اس سے خائف ہو کر بچے یا اس سے اپنے آپ کو بچائے یا اس سے دور ہو۔ بلکہ اللہ کی طرف آنا اور اس کا قرب حاصل کرنا تو عین انسانی زندگی کی غرض ہے۔ قرآن شریف میں سورۃ النساء کے شروع میں آتا ہے: ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ﴾ [النسآء 4:1] ''اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اور رحموں کا تقویٰ کرو۔'' ان دو لفظوں کو اکٹھا کر کے قرآن شریف نے تقوی اللہ کے معنی پر روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ رحموں کے تقویٰ سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رحموں کے حقوق کی حفاظت کرو۔

### تقویٰ اللہ حقوق کی نگہداشت اور متقی حقوق کی نگہداشت کرنے والا ہے:

پس ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ﴾ کے معنی بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور متقی وہی ہے جو حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور

اگر غور کیا جائے تو جو معنی امام راغب نے دیئے ہیں وہ یہی ہیں کیونکہ گناہ میں پڑنے سے انسان اپنے آپ کو اسی طرح بچا سکتا ہے کہ حفاظت حقوق کرے اور کوئی حق تلف نہ ہونے دے، اور یہی معنی حدیث میں ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے متقی اسی کو قرار دیا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کی برائیوں سے بچاتا ہے (اور بدی کا مفہوم حق تلفی ہے) یہاں تک کہ اگر برائی سے بچنے کے لیے کسی ایسے کام کو بھی چھوڑنا پڑے جس میں کوئی برائی نہیں تو وہ اسے بھی چھوڑ دیتا ہے۔ پس متقی اپنے آپ کو گناہ یا حق تلفی سے بچانے والا ہے اور ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ﴾ کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور چونکہ ہر قسم کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے ذمے رکھے ہیں اس لیے تقوی اللہ میں تمام حقوق کی نگہداشت آجاتی ہے اور اگر ڈرنا بھی اس کے معنی کیے جائیں تو خدا سے ڈرنا یا خوف کرنا اس کے عذاب سے ڈرنا یا اس سزا سے ڈرنا ہے جو گناہ پر ملتی ہے۔ پس اصل غرض پھر بھی گناہ سے بچنا ہوئی اور گناہ حقوق اللہ یا حقوق العباد کے ضائع کرنے کا نام ہے۔

## قرآن ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کس معنی سے ہے؟:

یہاں قرآن شریف کو ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ فرمایا یعنی متقیوں کے لیے ہدایت۔ اور دوسری جگہ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ [البقرة: 185:2] فرمایا۔ یعنی سب لوگوں کے لیے ہدایت۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ کس معنی سے؟ ہدایت کے مختلف معنوں کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ [دیکھو نمبر: 5] اس معنی سے سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ رستہ سب کو دکھا دیا اور کسی کے لیے کوئی روک نہیں۔ جو چاہے اسے اختیار کرے جو نہ چاہے نہ کرے، اور متقیوں کے لیے اس معنی سے ہدایت ہے کہ ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

## متقی کو ضرورتِ ہدایت:

یہ کہنا کہ جو متقی ہے اسے ہدایت کی ضرورت نہیں، لغو بات ہے۔ متقی وہی ہے جو اپنے آپ کو حق تلفیوں سے، ضرر دینے والی چیزوں سے، گناہ سے بچاتا ہے۔ اس کو ضرورت ہے کہ اسے بتایا جائے کہ یہ حقوق تمہارے ذمہ ہیں۔ یہ چیزیں ضرر دینے والی ہیں، حصول کمال کی یہ راہ ہے۔ ہدایت منجانب اللہ کے بغیر اور محض اپنی جدوجہد سے کوئی انسان کمال کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس جدوجہد کے ساتھ منجانب اللہ ہدایت بھی چاہیے تاکہ وہ اسے روشنی کا کام دے۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں دونوں پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ انسانی جدوجہد کی بھی ضرورت ہے اور وہ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ اسی سے منزل مقصود حاصل ہوتی ہے جس طرح ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الفاتحة 1:1] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب۔'' کہنے والا ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا اقرار کرنے والا ﴿اِهْدِنَا﴾ کی دعا کا محتاج ہے اسی طرح متقی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور دکھ دینے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اس کتاب، اس نور کا محتاج ہے تاکہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

## متقی کے لیے غیر متناہی ترقی:

علاوہ ازیں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ انسان جس قدر بھی چاہے تقویٰ میں ترقی کرتا چلا جائے ہمیشہ اپنے لیے اس کتاب میں نئی سے نئی روشنی آئندہ ترقیات کے لیے پائے گا۔ کسی مقام پر پہنچ کر یہ کتاب عاجز نہیں ہو جاتی کہ اس سے بڑھ کر کسی درجہ پر پہنچانے

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ جوغیب پر ایمان لاتے ہیں (11)

کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔جس طرح ترقی انسانی غیر متناہی ہے۔اسی طرح اس کتاب کا نور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

### تقویٰ کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے:

اور گویہ سچ ہے کہ خود تقویٰ کے بھی مدارج ہیں اور جو شخص تقویٰ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا اس کتاب سے ہدایت کا طالب ہوتا ہے وہ اس کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔تاہم اس آخری منزل کا نام یہاں فَلَاحٌ اور کہیں صِدِّیْقِیَّتٌ اور کہیں شَہِیْدٌ کا مرتبہ رکھا ہے۔تقویٰ یا دکھوں سے اپنے آپ کو بچانا ہی کمال انسانی نہیں بلکہ کمال انسانی کے حصول کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔اس کے مقابل پر وہ لوگ ہیں جو دکھوں اور تکلیفوں سے بچنے کی پروا نہیں کرتے۔ان کا ذکر آیت 6 میں ہے۔

11- ﴿یُؤْمِنُوْنَ﴾ اِیْمَان اٰمَنَ سے ہے اور آمَنَ کا استعمال دوطرح پر ہے۔متعدی جیسے اٰمَنْتُہٗ جس کے معنی ہیں میں نے اس کے لیے امن کر دیا۔اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا نام اَلْمُؤْمِنُ ہے یعنی امن عطا کرنے والا (اپنے بندوں کو)۔

### ایمان کا دوہرا مفہوم:

اور اس کا دوسرا استعمال غیر متعدی ہے۔جب آمَنَ کے معنی ہوں گے وہ امن والا ہو گیا۔اصطلاح میں اس کا استعمال بعض وقت صرف اقرار لسانی پر ہوتا ہے۔یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا جیسے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا﴾ [البقرۃ 62:2] ''جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے۔'' یا جیسے ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [النسآء 136:4] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔'' اور بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے اپنے آپ کو تصدیق کے طور پر حق کا بکلی فرمانبردار کر دینا اور اس کے لیے تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔زبان سے اقرار کرنا، دل سے حق جاننا اور اس کے مطابق اعضا سے کام کرنا جیسے: ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ﴾ [الحدید: 19:57] ''اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے یہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔'' اور پھر اس کا اطلاق اعتقاد اور سچے قول اور عمل صالح ہر ایک پر بھی ہو جاتا ہے۔(غ)

### ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی:

احادیث نبوی سے بھی ایمان کے اس معنی پر شہادت ملتی ہے بعض جگہ ایمان میں صرف اعتقاد کا ذکر کیا ہے اور بعض جگہ صرف اعمال صالحہ کا اور بعض جگہ دونوں کو ملا کر۔اول تو ظاہر ہے۔دوسرے کی مثال ہے کہیں فرمایا کہ ''حیا ایمان سے ہے''، کہیں فرمایا ''ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔'' اسی طرح دوسرے اعمال کو ایمان میں داخل کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کا بیج ہے لیکن اس کی نشوونما اس کی تکمیل بغیر اعمال صالحہ کے نہیں ہوتی۔

### ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں:

ایمان کا وہ مفہوم اسلام میں نہیں جو دوسرے مذاہب میں ہے۔جیسے مثلاً عیسائی مذہب میں کفارہ پر ایمان کہ محض ایک بات کے

وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ اور نماز قائم کرتے ہیں (12) اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا

اقرار کر لینے کا نام ہے۔ اسلام میں ایمان ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے مطابق ایک عمل ہے اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگین کرے۔ اس کی محبت اور معرفت کے حاصل کرنے کو زندگی کی اصل غرض سمجھے۔ فرشتوں پر ایمان ان کی نیک تحریکوں کو قبول کرنا ہے۔ رسولوں پر ایمان ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ کتابوں پر ایمان ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر ایک فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کسی اپنے کام کو انسان لغو نہ سمجھے۔ عَلٰی هٰذَا الْقِيَاسِ۔

﴿الْغَيْبِ﴾ مصدر ہے۔ جو چیز انسان کی آنکھ سے چھپ جائے اس پر غَابَ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو چیزیں حواس ظاہری سے مخفی ہوں اور غیب اور غائب کسی چیز کو محض لوگوں کے لحاظ سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ ﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ یعنی ان چیزوں کو جاننے والا ہے جن کو انسان نہیں دیکھتا اور ان کو بھی جنہیں وہ دیکھتا ہے۔ اور یہاں الْغَيْبِ سے مراد وہ امور ہیں جو حواس کے ماتحت نہیں آتے اور ہدایت عقلی ان کی مقتضی نہیں اور ان کا علم انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے۔ (غ) مفسرین میں سے کسی نے ﴿الْغَيْبِ﴾ سے مراد یہاں قرآن کو لیا ہے۔ (ج) حالانکہ اس کا ذکر علیحدہ ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ میں موجود ہے۔ اور بعض نے اللہ اور فرشتوں اور رسولوں پر ایمان۔ (ف) اور بعض نے اللہ تعالیٰ۔ (ر۔ف) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب در غیب اور نہاں در نہاں اور وراء الوراء ہے۔ یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ملائکہ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

## ایمان بالغیب کی حقیقت:

ابتدا میں بجائے اللہ پر ایمان کے الغیب کا لفظ کیوں اختیار فرمایا؟ ایک یہ بتانے کو کہ اس کی صفات پر آگہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ دوسرے تمام ترقیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ ہر ایک علم میں کچھ باتیں مان کر انسان چلتا ہے۔ نتائج ان کی صحت کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت پہلے دن حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ذات نہاں در نہاں ہے۔ ہاں اسی الْغَيْبِ پر ایمان لا کر جب انسان قدم آگے بڑھاتا ہے تو آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل بھی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس سے ہم کلام بھی ہو جاتا ہے گویا یوں کہنا چاہیے کہ غیب سے شروع کر کے قرآن مشاہدہ تک پہنچا دیتا ہے۔

فَلَاحٌ یا دینی اور دنیوی کامیابی کے لیے جو پانچ اصول اسلام نے یہاں ابتدائے سورت میں قرار دیئے ہیں ان میں سے پہلا یہ ایمان بالغیب یا ایمان باللہ ہے۔

12- ﴿يُقِيْمُوْنَ﴾ اَقَامَ کا مادہ قوم ہے اور اَقَامَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں کام کو درست حالت میں رکھا۔

## صلٰوۃ کی اقامت کا مفہوم:

قرآن کریم میں جہاں مدح یا تحریص کے مقام پر صلٰوۃ کا ذکر آیا ہے وہاں اَقَامَ یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے جیسے: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾، ﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ﴿الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ اور صلٰوۃ کے ساتھ اقامت کو خاص کیا ہے۔ متنبہ کرنے کو کہ مقصود اس کے حقوق اور شرائط کا پورا کرنا ہے۔ نہ صرف ظاہری صورت کا ادا کرنا اور اسی لیے یہ روایت ہے کہ مصلی یعنی نماز

پڑھنے والے بہت ہیں اور اس کے قائم کرنے والے تھوڑے۔ (غ) اور یہی وجہ ہے کہ ذم کے مقام پر لفظ مصلی اختیار کیا ہے نہ ﴿مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ﴾، ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ﴾ [الماعون: 4:107] ''پس ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے۔''

اقامت کے حقوق وشرائط کا ذکر خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ ① طہارت جسمانی جیسے وضو غسل وغیرہ [المآئدۃ: 6] ② اوقات مقررہ پر ادا کرنا ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [النسآء: 103:4] ''نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے۔'' ③ نماز پر دوام یعنی سب نمازوں کا ادا کرنا یہ نہیں کہ کوئی پڑھ لی، کوئی چھوڑ دی ﴿عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ [المعارج: 23:70] ''جو نماز پر ہمیشہ قائم ہیں۔'' ④ نماز کی محافظت۔ سفر ہو یا بیماری ہو جنگ ہو کوئی سی مشکلات ہوں نماز نہ چھوڑے ﴿هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ [المعارج: 34:70] ''اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔'' ⑤ نماز کی اصل حقیقت سے غافل نہ ہو: ﴿عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ [الماعون: 5:107] ''اپنی نماز سے غافل ہیں۔'' ⑥ ریا سے پاک ہو ﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ﴾ [الماعون: 6:107] ''جو دکھاوا کرتے ہیں۔'' ⑦ نماز کی ادائیگی میں طبیعت میں کسل نہ ہو۔ منافقوں کے ذکر میں ہے ﴿لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى﴾ [التوبۃ: 54:9] ''نماز کو نہیں آتے، مگر اس حال میں کہ وہ کاہل ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ کی نسبت احادیث میں ہے کہ آپ نماز میں راحت محسوس کرتے تھے۔ ⑧ باجماعت ہو ﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [البقرۃ: 43:2] ''اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھکے رہو۔'' ⑨ نماز میں خضوع وخشوع ہو ﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون: 2:23] ''جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔'' ⑩ بدیوں اور ناشائستہ امور سے رک جائے ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت: 45:29] ''نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے۔''

﴿الصَّلٰوةَ﴾ صَلٰی آگ کے جلانے پر بولا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہونے پر ﴿يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ [الأعلیٰ: 12:87] ''بڑی آگ میں داخل ہوگا۔'' ﴿سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ [النسآء: 10:4] ''وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔'' اور صَلٰوةٌ کے اصل معنی دعا اور برکت دینا ہیں۔ چنانچہ صَلَّيْتُ عَلَيْهِ کے معنی دَعَوْتُ لَهُ آتے ہیں یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور شاعر کہتا ہے: وَصَلّٰى عَلٰى دَنِّهَا وَارْتَسَمَ۔ اس کے مشکیزہ پر دعا اور التجا کرتا رہا۔ قرآن شریف میں ہے: ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [التوبۃ: 103:9] ''اور ان کے لیے دعا کر۔ کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ [الأحزاب: 56:33] ''اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔'' ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ [البقرۃ: 157:2] ''یہی وہ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے۔'' اور عبادت کی جگہ کو بھی صَلٰوة کہا جاتا ہے: ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ﴾ [الحج: 40:22] ''راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں گرا دی جاتیں۔'' اور وہ نماز مخصوص بھی اس سے مراد ہے جو نبی ﷺ نے مسلمانوں کو سکھائی اور وہ اقامت کے ساتھ صرف اسی ہیئت خاص سے ہی مخصوص ہے۔ (غ) یعنی اقامت صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنا ہی ہے۔

## نماز کی تفصیلات:

نماز کے متعلق قرآن شریف میں یہ تو فرمایا کہ نماز ﴿كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ ہے یعنی اس کا اوقات مقررہ پر ادا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کی تفصیلات کتنی دفعہ دن میں نماز ہو؟ کون کون سے وقت پر ہو؟ رکعات کی تعداد، ان کے ارکان اور ارکان کی ترتیب، اذکار

يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾ خرچ کرتے ہیں۔ (13)

کا ذکر قرآن شریف میں کسی ایک جگہ نہیں دیا۔ اشارۃ النص کے طور پر کوئی شخص کوئی نتیجہ نکال لے تو اور بات ہے۔

**ارکان واوقات میں اتحاد اسلامی:**

دوسری طرف ان تمام تفصیلات میں عالم اسلامی میں حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے۔ سنی، شیعہ، خوارج، مقلد، غیر مقلد۔ پھر وہ فرقے جو ایک دوسرے کے ہمیشہ دشمن رہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور ابتدا سے لے کر آج تک ایک ہی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ چین ہو یا افریقہ کا جنگل، جزائر بحر ہند ہوں یا روس کے دور دراز مقامات جہاں چلے جاؤ ایک ہی اوقات، ایک ہی تعداد رکعات، ایک ہی ترتیب پاؤ گے۔ جس طرح اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک ہے۔ اسی طرح نماز بھی ایک ہے۔

**آنحضرت ﷺ کی نماز:**

یہ اتفاق کبھی پیدا نہ ہوسکتا اگر ﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ کے سب سے پہلے عامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ اور پھر آپ کو دیکھ کر صحابہ اور ان کو دیکھ کر تابعین نے علیٰ ہذا یہی نماز پڑھی۔ پس یہی وہ الصلوٰۃ ہے جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے۔

**ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق:**

یہ نماز اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لیے ایمان بالغیب کے بعد فوراً اس کا ذکر کیا اور ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر اصول میں داخل کر کے اس کی اہمیت بتا دی۔ خدا پر ایمان ایک منہ کی بات رہتی اگر اس کے ساتھ وہ ذریعہ نہ بتا دیا ہوتا جس سے اس نہاں در نہاں ہستی سے انسان کا تعلق پیدا ہوسکتا۔ یعنی انسان اپنے کمال حقیقی کو پہنچ سکتا ہے۔ صلوٰۃ چونکہ خدا کے آگے گرنے اور عاجزی کا نام ہے اس لیے جس قدر زیادہ انسان خدا کے حضور گرے گا اسی قدر زیادہ اخلاق الٰہی میں رنگین ہوگا اور ایمان کی اصل غرض پوری ہوگی۔ پس نماز دوسرا رکن ان پانچ ارکان میں سے ہے جو اسلام کی بنیاد قرار دیئے گئے ہیں اور عملی ارکان میں سے یہ پہلا ہے۔

13- ﴿رَزَقْنٰهُمْ﴾ رزق کا لفظ کبھی عطائے جاریہ پر استعمال ہوتا ہے دنیوی ہو یا آخرت کے متعلق۔ کبھی حصہ یا نصیب پر، کبھی غذا پر۔ (غ) اس لیے یہاں ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ میں نہ صرف مال داخل ہے بلکہ جاہ اور علم بھی۔ (غ) بلکہ جو کچھ قویٰ انسان کو دیئے گئے ہیں سب اس میں شامل ہیں۔

﴿يُنْفِقُوْنَ﴾ اِنْفَاق نَفَقَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز گزر گئی اور نَفَق سرنگ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کے اندر چلی جاتی ہے اور اسی سے نفاق ہے جس کے معنی ہیں ایک رستہ سے دین میں داخل ہونا اور دوسرے سے نکل جانا۔ (غ) اور اَنْفَقَ جب لازم ہو تو اس کے معنی مال جاتا رہنے کے ہوتے ہیں جیسے: ﴿اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ﴾ [بني إسرائيل: 100:17] جہاں

| | |
|---|---|
| وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ | اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا |
| اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ | گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا(14) اور آخرت پر |

انفاق کے معنی فناء ہیں اور متعدی ہو تو خرچ کرنا معنی بھی ہوتے ہیں۔(ت)

**انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم:**

یہ تیسرا اصول ہے اور عملی رنگ میں دوسرا جس کو اختیار کیے بغیر فلاح حاصل نہیں ہوسکتی۔اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ اپنی تمام طاقتوں کو اور مال کو اور علم کو خدا کی راہ میں یعنی مخلوق کی بھلائی کے لیے لگادے۔زکوٰۃ کی ادائیگی محض اس کا ایک حصہ ہے۔نماز کے بعد اس کا ذکر ترتیب طبعی کے مطابق ہے اس لیے کہ مخلوق کی خیر خواہی صحیح رنگ میں وہی انسان کرسکتا ہے جس کا تعلق خالق سے پیدا ہو۔اور خالق سے تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ نماز ہے۔پس جب نماز سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انسان خدا سے تعلق پیدا کرکے اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوا اور صفات الٰہی میں سب سے پہلی صفت ربوبیت ہے تو انسان کے لیے مخلوق کی خدمت ضروری ٹھہری کیونکہ اگر بذریعہ نماز خدا سے تعلق پیدا کرکے مخلوق کی خدمت کا شوق پیدا نہیں ہوا تو نماز کی اصل غرض ہی مفقود ہوگئی۔

**صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت:**

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ہمیشہ اقامت صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا یا خدمت مخلوق کا ذکر آتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز کی حقیقت سے بے خبری کا ذکر کیا وہاں بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز صرف دکھاوے کی پڑھتے ہیں۔کیونکہ مخلوق خدا کی خدمت کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے۔﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴾[الماعون: 107:6-7]''جو دکھاوا کرتے ہیں اور خیرات کو روکتے ہیں۔''

**حسن واحسان:**

عملی طور پر تکمیل نفس انسانی کے یہ دو ہی پہلو ہیں۔خدا کے حضور جھکنا اور مخلوق خدا کی خدمت۔ایک کو حسن کہہ لو، دوسرے کو احسان۔جب نماز کے ذریعہ سے حسن پیدا ہوا تو﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ میں احسان کی تعلیم دی۔

14- ﴿اُنْزِلَ﴾ نزول کے اصل معنی گو اوپر سے نیچے آنے کے ہوں مگر استعمال میں اوپر سے نیچے آنا اس کے معنی میں ضروری جزو نہیں اور انزال مطلق ایصال و ابلاغ ہے یعنی ایک چیز کا پہنچادینا۔(غ) قرآن کریم میں ہے: ﴿اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾[الأعراف: 26:7] ''ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے عیبوں کو ڈھانکے۔''﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾[الزمر: 6:39] ''اور تمہارے لیے چارپائیوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔''﴿وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾[الحديد: 25:57] ''اور ہم نے لوہا اتارا۔'' حالانکہ لوہا، چارپائے، لباس اوپر سے نہیں اترتے۔

**وحی اور رسول کا نزول:**

تَنْزِيْلٌ یا اِنْزَالٌ کا لفظ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی وحی پر استعمال ہوا ہے بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کو بھی اَنْزَلَ کے لفظ

هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ وہ یقین رکھتے ہیں۔ (15)

---

سے ہی تعبیر کیا ہے۔ ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا﴾ [الطلاق: 65:10-11] ''اللہ نے تمہاری طرف ذکر اتارا ہے (وہ) رسول۔'' جس کی تفسیر کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کا نام ذِکر رکھا جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام کلمۃ رکھا اور لکھتے ہیں انزال ذکر سے مراد بعثت آنحضرت ﷺ ہے۔

## وحی الٰہی پر ایمان:

اب چوتھا اصول بیان فرماتا ہے جس پر ایک متقی انسان کو عمل پیرا ہونا چاہیے اور وہ ہے ایمان اس پر جو محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف اتارا گیا اور اس پر جو آپ سے پہلے اتارا گیا۔ اور اعتقادی اصول میں سے یہ دوسرا ہے گویا پہلا ایمان باللہ اور دوسرا وحی الٰہی پر ایمان۔ کیونکہ اللہ پر ایمان پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وحی پر ایمان نہ ہو۔ وحی الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے۔ پس ایمان کامل اللہ تعالیٰ پر صرف وحی سے پیدا ہوتا ہے اور خالی نظارہ قدرت سے کبھی ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان اقرار کرسکتا ہے کہ اس کا کوئی صانع ہے۔ مگر ایمان جس سے عمل کی طاقت پیدا ہوتی ہے وہ اس تعلق کے قیام سے پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہے اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اسی کی طرف خود لفظ اَلْغَيْب میں بھی اشارہ ہے۔

## پہلی وحی پر ایمان میں حکمت:

مگر یہاں وحی پر ایمان کی ضرورت میں صرف قرآن پر ایمان ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ پہلے بھی وحی الٰہی انبیاء پر آتے رہنے کو جزو ایمان قرار دیا۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ سے کوئی الگ معاملہ نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کا یہ تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور اس لیے بھی ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی ضرورت پیش آئی کہ قرآن کی وحی کل عالم کی طرف تھی اور کل قوموں کو اس پر اکٹھا کرنا تھا۔ اس لیے پہلی وحیوں کا ذکر کرنا اس کے لیے ضروری ہوا۔ غرض ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کہہ کر ایک عظیم الشان اتحاد کی بنیاد رکھی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جسمانی ساری انسانوں کے لیے ہے اس کی ربوبیت روحانی بھی سب قوموں کے لیے ہے۔ ایک عرب کے امی نے یہ اصول دنیا کو سکھلایا جس کو بڑے سے بڑے فلاسفر دریافت نہ کرسکے۔ جہاں ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ یعنی قرآن کریم پر عمل ضروری ہے۔

## پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں:

وہاں پہلی کتابوں کے متعلق چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف نے خود بیان فرمادیا کہ ان میں تحریف ہوچکی ہے اس لیے ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم وقتی ضرورت زمانہ اور ضرورت مکان کے لحاظ سے تھی جس کا بہت سا حصہ قابل عمل در آمد نہ رہا اور جو تعلیم ہمیشہ رہنے کے قابل تھی اسے قرآن شریف نے اپنے اندر کامل طور پر جمع کرلیا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ [البينة: 3:98] ''جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔'' پس عمل کی ضرورت صرف قرآن پر ہے۔

15- ﴿الْاٰخِرَةِ﴾ اٰخِر اول کے مقابلہ پر ہے۔ اور اٰخَر واحد کے مقابلہ پر اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے مراد اَلنَّشْاَةُ الثَّانِيَةُ ہے یعنی دوسری زندگی اور کبھی دار کا لفظ محذوف کرکے ﴿الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد دَارُ الْآخِرَةِ لیا جاتا ہے۔ (غ) یہ تو لغت کی شہادت

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی

ہے۔قرآن شریف کو دیکھا جائے تو اس میں ﴿الْاٰخِرَةِ﴾ کا لفظ جہاں ایمان بالاخرة یا کفر بالاخرة کا ذکر ہے اس موقعہ کے سوائے اٹھارہ موقعہ پر آتا ہے اور کسی ایک جگہ بھی سوائے اَلنَّشْأَةُ الثَّانِيَةُ کے کوئی دوسرے معنی مرادنہیں۔ پس یہ قطعی شہادت ہے۔ دیکھو[الأنعام: 92:6, 113, 150]،[الأعراف: 45:7]، [هود: 19:11]،[يوسف: 37:12]،[النحل: 60, 22:16]،[بني إسرائيل: 45:17]،[المؤمنون: 74:23]،[النمل: 3:27, 4]،[لقمان: 4:31]،[السبأ: 8:34, 21]،[الزمر: 45:39]،[حٰمٓ السجدة: 7:41]،[النجم: 27:53] پس﴿الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد اَلْوَحْیُ الآخِرُ لینا اور پھر یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور وحی بھی نازل ہونے والی ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہوگا خلاف قرآن کریم ہے۔

﴿يُوْقِنُوْنَ﴾ یقین۔علم کی وہ صفت ہے جو معرفت ودرایت وغیرہ سے بڑھ کر ہے۔(غ)

## ایمان بالآخرہ کا مفہوم:

اِيْمَان بِالْاٰخِرَة پانچواں اصول مذہب کا قرار دیا۔اَلْاٰخِرَةُ یا اَلنَّشْأَةُ الثَّانِيَةُ وہ زندگی ہے جو انسان کے ان اعمال کا نتیجہ ہے جو وہ اس دنیوی زندگی میں کرتا ہے اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان اعمال کی جزا وسزا پر یقین کامل رکھے۔جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجہ کو برا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔پھر اگر فوری نتیجہ ایک کام کا اچھا بھی ہو مگر آخر کار اس کا اثر برا ہو تو عقلمند انسان اس سے بھی بچتا ہے۔کھیل کود کو ایک نادان بچہ پسند کرے گا مگر ایک عقلمند انسان آج سے دس بیس بعض وقت سو سو سال آئندہ کے نتائج پر نگاہ رکھتا ہے۔یورپ کے مدبرین کی چالیں اسی اچھی صفت کا استعمال بد ہیں۔جتنی وسیع نگاہ ہوگی اسی قدر زیادہ ایک شخص ضرر سے بچ سکے گا۔

## مذہب کی اصل غرض:

مذہب انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اعمال کے نتائج صرف اسی انسانی زندگی تک محدود نہیں، بیس اور سو سال تک محدود نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک چلتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کے بعد بھی انسان پر اپنا اچھا یا برا اثر ڈالتے ہیں۔ بلکہ جس طرح یہاں بعض وقت فوری نتیجہ ایک فعل کا اچھا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام برا ہوتا ہے۔اسی طرح اس دنیا میں ایک فعل کا نتیجہ اچھا نظر آیا ہے مگر دوسری زندگی میں اس کا نتیجہ بد ہوتا ہے۔پس جو عمل فی نفسہ برا ہے اس کا نتیجہ یہاں اچھا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ ترک کرنے کے قابل ہے جو عمل فی نفسہ اچھا ہو اس کا نتیجہ یہاں برا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ کرنے کے قابل ہے۔ یوں ہر ایک عمل کی ذمہ داری اس عمل کے اچھا یا برا ہونے کے لحاظ سے انسان کو سمجھنی چاہیے نہ ان نتائج سے جو ممکن طور پر اس دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں ایک شخص جھوٹ بول کر دوسرے کا مال لے سکتا ہے اور سزا سے بھی بچ سکتا ہے۔ایک قوم بوجہ اپنی طاقت جسمانی کے دوسری پر ظلم کر سکتی ہے اور اس کا کچھ بگڑتا بھی نظر نہیں آتا۔مگر ایک متقی انسان جو کچھ کرے محض اس بات کو مدنظر رکھ کر کرے کہ یہ کام اچھا ہے یا برا۔

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ | کامیاب ہونے والے ہیں۔(16)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ | جنہوں نے انکار کیا (یہاں تک) کہ ان کے لیے برابر ہے کہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ نہیں مانتے۔(17)

---

**جزاوسزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے:**

﴿الْاٰخِرَةِ﴾ کے ساتھ یقین کا لفظ بتاتا ہے کہ اعمال کی جزاوسزا پر جب تک یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ بہت لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر چونکہ دل میں یقین نہیں اس لیے گناہ کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس شخص کو یقین ہو کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ پس کس طرح وہ اعمال کی جزاوسزا پر یقین رکھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرسکتا ہے؟

16- ﴿عَلٰى هُدًى﴾ یعنی ہدایت پر متمکن ہو گئے اور اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوں گے اور ان کو ایک نور اور روشنی مل جاتی ہے یہ معنی ہدایت کے یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیے ہیں۔ (ج)

﴿الْمُفْلِحُوْنَ﴾ فَلَحَ کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے کسان کو فلاح کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ظَفَرٌ وَاِدْرَاكُ بُغْيَةٍ ہیں۔ (غ) یعنی کامیابی اور مطلوب کا پالینا۔ کیونکہ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور اصلی جوہر باہر نکل آتے ہیں اسی طرح قوائے انسانی کا بھی حال ہے۔ اس کے مخفی جوہروں کا باہر نکل آنا ہی حقیقت میں کامیابی ہے۔ پس فَلَاح سے مراد صرف دنیوی کامیابی نہیں بلکہ انسان کے مخفی قویٰ کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ محض دنیا کا مال کما لینا یا بادشاہت کا حاصل کر لینا فلاح نہیں اور نہ ایسا شخص مُفْلِح کہلا سکتا ہے۔ بلکہ فَلَاح کے معنی اَلْفَوْزُ وَالْخَيْرُ یعنی دنیوی اور دینی دونوں کامیابیوں کو شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں ہے کہ آئمہ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فَلَاحٌ کے لفظ سے بڑھ کر دینی اور دنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا اور کوئی لفظ نہیں۔

**مفلح کون ہیں؟:**

یہاں یہ فرمایا کہ ان پانچ اصولوں کو قبول کر کے قرآن کریم کو اپنا دستور العمل بنا لینے والے لوگ ہدایت پر ہیں۔ اور ان کے ہدایت پر ہونے کی یہ دلیل ہے کہ وہ فلاح حاصل کرلیں گے یعنی دینی واخروی کامیابی حاصل کرلیں گے اور ان کے جسمانی اور روحانی قویٰ اعلیٰ درجہ کا نشوونما پالیں گے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کا ثبوت دنیا کو دے دیا۔ گویا ﴿عَلٰى هُدًى﴾ دعویٰ تھا ﴿هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اس کی دلیل ہے۔

17- كَفَرَ- كَافِرٌ۔ كَفَرُوْا اور كُفْرٌ لغت میں سَتْرُ الشَّيْءِ یعنی ایک چیز کو ڈھانکنے کا نام ہے۔ چنانچہ رات کو کافر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اور کفر نعمت کی ناشکر گزاری ہے اس لیے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا گویا اس کو چھپانا ہے اور سب سے بڑا کفر انکار توحید یا شریعت یا نبوت ہے۔ (غ)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى — اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی

## ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے، اصل اور فرع کا کفر:

اور جس طرح ہر ایک فعل محمود یعنی قابل تعریف فعل ایمان سے ہے۔ اسی طرح ہر ایک فعل مذموم کفر ہے۔ (غ) اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کفر دو قسم کا ہے ایک اصل ایمان کا کفر اور اس کی ضد اور دوسرا فروع اسلام میں سے کسی فرع کا کفر۔ اس سے انسان اصل ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ چنانچہ ازہری کا قول نقل کیا ہے: [قَدْ يَقُوْلُ الْمُسْلِمُ كُفْرًا] پس اصطلاح شریعت میں کفر ہمارے نبی کریم ﷺ کا انکار ہے۔ اور اس کے نیچے جو بعض افعال کا نام کفر رکھ دیا ہے۔ جیسے: [سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَّقِتَالُهُ كُفْرٌ] (صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لاَ يَشْعُرُ ....: 48) ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔'' یا [مَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِيْهِ فَقَدْ كَفَرَ] (صحیح ابن حبان: جلد 4، صفحہ 328) ''جو اپنے باپ کی طرف راغب ہوا اس نے کفر کیا۔'' وغیرہ تو یہ محض فرع کا کفر ہے۔ دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا اور اصل معنی میں وسعت ہے۔

﴿ءَاَنْذَرْتَهُمْ﴾ اَنْذَرْتَ نَذْرٌ سے ہے جس کے معنی ہیں اپنے نفس پر کسی چیز کو واجب کر لینا۔ (غ) اور اَنْذَرَ یا اِنْذَار کے اصل معنی قاموس میں صرف اَعْلَمَ ہیں۔ یعنی ایک بات کا اس کو علم دے دیا۔ (ت) اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ اِنْذَار یہ ہے کہ ایک بات کے پہنچانے میں انسان کو محتاط کیا جائے اور ڈرایا جائے اور اصل معنی انذار کے اعلام ہی ہیں۔ یعنی ایک بات سے آگاہ کر دینا۔ (ت) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ منذر ایسا علم دینے والا ہے جو قوم کو خطرات سے آگاہ کرے جیسے دشمن وغیرہ سے۔ پس انذار کے اصل معنی دھمکانا نہیں بلکہ ایک علم دینا ہیں اور بالخصوص وہ علم جو کسی آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔

## اضداد کا ذکر:

قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اضداد کا ذکر بالمقابل کر کے اصل مقصود کو ظاہر کرتا ہے جب متقیوں کا ذکر کیا اور ان کے فلاح پانے یعنی اپنے کمال حقیقی کو پہنچ جانے کا۔ تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ جب ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارے یہ افعال برے ہیں اور ان کا نتیجہ اچھا نہیں تو وہ پرواہ بھی نہیں کرتے۔ متقی تو وہ ہے جو ہر ایک دکھ کی بات سے بچتا ہے اور اس کے مقابل پر وہ شخص ہے جس کو جب بتایا جاتا ہے کہ دکھ دینے والی چیز ہے تو پرواہ بھی نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کہنے سے جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ جب یہ کتاب تمام دنیا کے لیے ہے تو کیا بعض قسم کے لوگ اس سے محروم بھی رہ جائیں گے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ محروم وہی رہیں گے جن کو پرواہ نہیں۔

## انذار کی پرواہ نہ کرنے والے:

جملہ ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ جملہ معترضہ ہے جو ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کی حالت کو بیان کرتا ہے۔ بحر المحیط اور روح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس کو جملہ معترضہ نہ ماننے کی صورت میں کوئی معنی صحیح نہیں بنتے۔

سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٘ اوران کی آنکھوں پر پردہ ہے(18)

کیونکہ اگر اسے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کی خبر قرار دیا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ جو کافر ہوئے ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعات ہے اور خلاف واقعات معنی قرآن کریم کے قبول نہیں ہو سکتے۔آنحضرت ﷺ کفار کو ہی ڈراتے تھے اور قرآن کریم میں بھی بار بار کفار کو ڈرانے کا حکم ہے۔اور ان میں سے لوگ مسلمان بھی ہوتے گئے۔پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔اور یہ سچ بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پروا نہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کر لیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اٹھا لیتا ہے۔یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں۔

18- ﴿خَتَمَ﴾ خَتَمَ اور طَبَعَ کے لغت میں ایک ہی معنی ہیں۔یعنی ایک چیز کو ڈھانک دینا اور ایسا مضبوط باندھ دینا کہ دوسری چیز اس میں داخل نہ ہو سکے۔(ت)

**دلوں پر مہر سے مراد:**

امام راغب نے مفردات میں دلوں پر خَتَمَ یا مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی طرح پر حق کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تو یہ اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھا سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔اور لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے: ﴿جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾[الأنعام: 25:6] ''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اسے سمجھیں نہیں۔'' میں یا ﴿جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾[المآئدة: 13:5] ''ان کے دل سخت کر دیئے۔'' میں استعارہ ہے۔

﴿غِشَاوَةٌ﴾ غَشِيَ سے مادہ ہے۔جس کے معنی ڈھانکنا ہیں۔اور ﴿غِشَاوَةٌ﴾ وہ ہے جس کے ساتھ کوئی چیز ڈھانکی جائے۔ غَشِيَ، يَغْشٰى، تَغْشٰى، غَاشِيَةٌ، مَغْشِيٌّ، اِسْتَغْشَوْا وغیرہ بہت سے مشتقات اس سے قرآن شریف میں آئے ہیں۔

**خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے:**

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ہے۔﴿عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ میں جو ضمیر هِمْ ہے وہ عام کافروں کی طرف نہیں جاتی۔بلکہ صرف انہی کفار کی طرف جن کے لیے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے جو کفر کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔پس یہ مہر لگانا ابتدا کے طور پر نہیں کہ بعض انسانوں کو خدا نے پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔بلکہ یہ مہر لگانا بطور نتیجہ کے ہے۔ جب ایک شخص اپنے دل سے غور و فکر کا کام نہیں لیتا تو وہ قوت سلب ہو جاتی ہے۔جس طرح اگر ہاتھ سے کچھ مدت تک بالکل کام نہ لے تو وہ ہاتھ بے کار ہو جاتا ہے۔ہاں جس طرح یہ جسمانی قوتیں بھی خاص علاج سے لوٹ آتی ہیں اسی طرح دلوں کی مہر بھی جو اللہ تعالیٰ بطور سزا لگاتا ہے ٹوٹ جاتی ہے۔قرآن کریم اس کا بھی علاج کرتا ہے کیونکہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ﴾[یونس: 57:10] ''اس کے لیے شفا جو سینوں میں ہے۔'' ہے مگر علاج اسی کے لیے ہے جو علاج کرانا چاہے۔

## قرآن وحدیث کی شہادت کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے:

اس معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ فرماتا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففين: 14:83] ان کے دلوں پر اسی نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے۔ پس انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ لگاتے ہیں مہر بھی کر دیتے ہیں۔ زنگ لگنا پہلا مرتبہ ہے۔ مہر لگ جانا آخری مرتبہ۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کرے تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے (قلب سے مراد قلب روحانی ہے) اور اگر اور گناہ کرتا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ﴿رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ گویا وہ روشنی جو خدا نے انسان کے اندر رکھی تھی وہ بالکل دب جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنگ یا مہر کافر کے ساتھ خاص نہیں۔ مسلمان بھی بدیوں کے ارتکاب کی عادت کرلے تو اس کے دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے۔ پس اس آیت نے ایک پر حکمت فلسفہ بدی کا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

## عقل سے کام نہ لینا دل پر مہر ہے:

مہر لگانے سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور کئی صحابہ سے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے: [لَا يَعْقِلُونَ وَ لَا يَسْمَعُونَ] (تفسیر البحر المحیط: جلد7، صفحہ 280) وہ نہ عقل سے کام لیتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ خود قرآن کریم نے یہی تشریح فرمائی ہے۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [محمد: 16:47] اور ان میں ایسے لوگ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو جن کو علم دیا گیا کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ گویا مہر لگنا اس حالت کا نام ہے کہ انسان بات کو سنتا ہے سمجھتا نہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ [الأعراف: 179:7] "ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سننے کا کام نہیں لیتے۔"

## برے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے:

جب انسان ایک برے کام کے ارتکاب پر قائم ہو جاتا ہے تو اس کی حالت آہستہ آہستہ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اس برے کام کو اچھا سمجھنے لگتا ہے یہ اسکے دل پر مہر ہے۔ کیونکہ پھر اس کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ جو میں کر رہا ہوں کوئی برا کام ہے۔

## مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف:

مہر کا لگانا اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے منسوب کیا کہ انسان کے ہر فعل پر جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرلے تو اللہ تعالیٰ اس پر اندھیرا کر دیتا ہے یا ہاتھ سے کام لینا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ہاتھ کو بیکار کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب ایک انسان کو بدی کے بدانجام سے ڈرایا جائے اور وہ پروا بھی نہ کرے بلکہ بدی میں ترقی کرتا چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

ع 1/7 1 وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷ ع — اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (19)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ — اور لوگوں میں سے بعض ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور وہ مومن نہیں۔ (20) وقف لازم

---

**زرتشتی عقیدہ کی تردید:**

اس میں زرتشتیوں کے اس غلط عقیدہ کی تردید بھی کی ہے کہ نور خدا کی طرف سے ہے اور ظلمت شیطان کی طرف سے۔ اسلام تمام اسباب کا مسبب اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔

19- ﴿عَذَابٌ﴾ اس کا مادہ عَذْبٌ ہے اور مَآءٌ عَذْبٌ شیریں اور عمدہ پانی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ [الفرقان: 53:25] ''یہ میٹھا مزیدار ہے۔'' اور عَذَابٌ سخت دکھ کو کہتے ہیں جس کی وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنی آتے ہیں اس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ گویا تَعْذِيْب اصل میں یہ ہے کہ اس کو کھانے پینے، نیند سے محروم کیا جائے اور بعض کے نزدیک تعذیب میں ازالہ عذب ہے یعنی زندگی کی اچھی چیزوں کو دور کر دینا۔ جیسے تمریض مرض کے دور کر دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اچھی چیزوں سے محروم ہو جانے کا نام عذاب ہے۔

**عذاب کا استعمال قرآن میں:**

قرآن کریم نے ہر ایک سزا یا تکلیف کے پہنچنے پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ جہاں ایک باغ والوں کو اپنی محنت کا پھل نہیں ملا، اس کو بھی عذاب کہا۔ ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ [القلم: 33:68] ''اسی طرح عذاب آئے گا۔'' دنیا میں جو قوموں پر تباہیاں اور دکھ آتے ہیں ان کو بھی عذاب کہا ہے۔ کسی جرم پر جو سزا دی جاتی ہے اس کو بھی عذاب کہا ہے۔ ﴿وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا﴾ [النور: 2:24] ''سزا کے وقت موجود ہو۔'' آخرت کی سزا کو بھی عذاب کہا ہے۔ انسان کا دل جو بدی کے بعد دکھ محسوس کرتا ہے وہ بھی عذاب ہے۔

**﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اور ﴿عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾:**

قرآن کریم میں کبھی عذاب کو بلحاظ اس کی ظاہری کیفیت کے عَظِيْمٌ کہا ہے۔ یعنی بڑا عذاب اور کبھی بلحاظ اس دکھ کے جو انسان اندر ہی اندر اٹھاتا ہے اَلِيْمٌ کہا ہے۔ یعنی دردناک عذاب۔ اسی مناسبت سے یہاں کفار کے عذاب کو جو ظاہر میں واقع ہونے والا تھا ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ کہا ہے۔ اور آیت 10 میں منافقوں کے عذاب کو ﴿عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ کہا ہے۔

20- **اللہ اور آخرت پر ایمان مسلمان ہونے کے قائم مقام ہے:** یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے قائمقام رکھا ہے۔ کیونکہ اللہ کی صفات اور آخرت کے مسئلہ کو کھول کر قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے اور دوسرے شروع میں جو اصول بیان کیے ہیں ان میں سے پہلا اصول اللہ پر ایمان اور آخرت پر یقین ہے۔ پس اول و آخر کو سب کا قائم مقام بنا لیا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾

وہ اللہ کو اور ان کو جو ایمان لائے ہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے (کسی کو) دھوکا نہیں دیتے اور وہ سمجھتے نہیں۔ (21)

---

یہاں منافقوں کے ذکر میں جو منہ سے اسلام کا اقرار کرتے تھے ایمان ﴿بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ کو لا کر اس کے معنی کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس سے مراد مسلمان ہونا ہے۔

پہلے رکوع میں دو گروہوں کا ذکر کیا۔ اول کامل طور پر ماننے والے۔ دوسرے کلی طور پر انکار کرنے والے۔ یہاں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا ہے جو منہ سے کہتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ مدینہ میں عبداللہ بن اُبی قوم خزرج میں سے ایک بڑا سردار تھا جس کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے والے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی مدینہ میں آمد سے صورت معاملہ بدل گئی اور سب قوموں نے یہودیوں سمیت آنحضرت ﷺ کو سب جھگڑوں کا آخری فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا تو عبداللہ بن اُبی کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

### اسلام کے اندرونی دشمن:

جہاں اور کھلے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے اس نے اپنے اردگرد ایک چھپا ہوا دشمن اسلام گروہ پیدا کر لیا۔ ان لوگوں کو اسلام سے فی الواقع کوئی تعلق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ظاہرداری کے طور پر مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے، مگر اندرونی طور پر پورا زور اسلام کے استیصال کے لیے لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ان سب حالات میں بچا کر دکھا دیا کہ اسلام کو نہ اس کے کھلے دشمن کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ چھپے ہوئے۔ کیونکہ خدا کا ہاتھ اس کی تائید میں ہے۔

### منافقین زمانہ حال:

اس زمانہ میں مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ہے جو دشمنان اسلام کے ساتھ مل کر اسلام کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ گو بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں ان کے حالات ان منافقین سے جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں تھے بہت ملتے ہیں۔

### عملی نفاق:

لیکن ان کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو منہ سے قرآن کریم پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر عمل کے وقت اپنے رسوم اور خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور قرآن کو پس پشت ڈالتے ہیں۔ یہ عملی نفاق ہے اور اسی کا نتیجہ وہ ذلت وادبار ہے جو آج مسلمانوں کے شامل حال ہے۔

21- ﴿يُخٰدِعُوْنَ﴾ خَدَعَ اس کا مادہ ہے جس کے معنی دھوکہ دینا ہیں۔ یعنی ظاہر کچھ کرنا اور دل میں دوسری بات چھپا رکھنا۔ اس ارادہ سے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے اور خَادِع کسی کو دھوکا دینے کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں مُفَاعِلَةٌ کا باب بعض وقت صرف ایک کے لیے بھی آتا ہے جیسے عَاقَبْتُ اللِّصَّ میں۔ پس ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ کے معنی ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا

ان کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری کو بڑھایا(22) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس

﴿يَشْعُرُوْنَ﴾ شَعَر بال کو کہتے ہیں اس کی جمع اَشْعَار آتی ہے۔ ﴿وَ اَشْعَارِهَآ﴾ [النحل: 80:16] ''اور ان کے بالوں سے۔'' اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں ایک چیز کا ایسا دقیق علم حاصل کیا گویا کہ اس کے بالوں تک پہنچ گیا۔ اور شعر بھی اصل میں دقیق کلام کو کہتے ہیں۔ (غ) پس شعور علم سے زیادہ باریک بینی کو چاہتا ہے۔

## منافقوں کی دھوکہ بازی:

منافقانہ چال سے ان کا مطلب تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیں جو گویا خدا کو ہی دھوکا دینا تھا یعنی مسلمان ان کو اپنے مددگار اور حامی سمجھیں۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود نقصان اٹھایا، مسلمانوں کا ان شرارتوں سے کچھ نہ بگڑا۔ یہی اپنے آپ کو دھوکا دینا تھا۔

22- ﴿مَّرَضٌ﴾ **مَرَض** اس حالت اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے۔ اور یہ دو طرح پر ہے ایک جسمانی جیسے: ﴿لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ [النور: 61:24] ''نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔''

## امراض روحانی:

اور دوسرے اس سے مراد رذائل لیے جاتے ہیں۔ جیسے جہالت، جبن، بخل، نفاق وغیرہ۔ یعنی اخلاقی بیماریاں۔ (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں اور قرآن شریف میں کثرت سے مرض کا ذکر اسی معنی میں آتا ہے۔ اور اخلاقی رذائل کو مرض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ فضائل کے حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں جیسے بیماریاں۔

## منافقوں کی بیماری:

وہ بیماری نفاق ہے جس کا یہاں ذکر کر دیا یعنی منہ سے جو کچھ کہتے ہیں اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اسی لیے ﴿عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ کو جھوٹ کا نتیجہ بتایا۔ یا یہ بیماری اسلام کی عداوت ہے جو اپنے دلوں میں مخفی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا اس سے بیماری کو بڑھانا یوں تھا کہ جوں جوں اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت اور شوکت عطا کرتا گیا ان کا نفاق اور ان کی اسلام سے عداوت اور ترقی کرتی گئی۔

## خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے؟:

اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری کا بڑھانا منسوب کیا۔ کیونکہ یہ بطور سزا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ اسباب جن سے بیماری بڑھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیے تھے۔ گو وہ چاہتے تو انہی اسباب سے ہدایت حاصل کر سکتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا﴾ [نوح: 6:71] میرے بلانے نے ان کو صرف بھاگنے میں زیادہ کیا۔ حالانکہ دعوت کی غرض تو ان کا بلانا تھا نہ بھگانا۔ مگر چونکہ جس قدر وہ بلاتے تھے اسی قدر وہ زیادہ دور ہوتے تھے۔ اس لیے بھگانے کو دعا کی طرف منسوب کیا گو وہ دعا کا مقصد نہ تھا۔

یَکْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ لیے کہ جھوٹ بولتے تھے۔ (23)

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، کہتے ہیں

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ یقیناً یہ خود ہی فساد کرنے والے ہیں، پر سمجھتے نہیں۔ (24)

---

23- ﴿یَکْذِبُوْنَ﴾ کِذْبٌ۔ صِدْقٌ کی ضد ہے اور صدق کی طرح قول اور فعل دونوں پر بولا جاتا ہے۔(غ) جھوٹ بول کر انسان کو کبھی راحت نہیں ملتی۔

### جھوٹ منافق کا نشان ہے:

منافق کی چار علامتیں حدیث میں لکھی ہیں۔ان میں سے سب سے بڑی یہی ہے کہ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔مسلمانوں میں اس زمانہ میں یہ بیماری بہت بڑھی ہوئی ہے۔باتوں میں جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹی شہادتیں دیتے اور جھوٹے اقرار کرتے ہیں۔حکام کو خوش کرنے کے لیے بھی جھوٹ بول دیتے ہیں۔کسی قوم میں ایسے لوگوں کی زیادتی سے قوم کی عزت باقی نہیں رہ سکتی۔

### صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں:

ان کے بالمقابل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حالت دیکھو تو وہاں عمداً جھوٹ کا وجود بھی نہیں پایا جاتا۔یہاں تک کہ جو روایت صحابی تک پہنچ جائے اس پر جھوٹ کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

24- ﴿تُفْسِدُوْا﴾ فَسَاد کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا ہے تھوڑا ہو یا بہت۔اس کی ضد صلاح ہے اور اس کا استعمال نفس میں اور بدن میں اور اشیاء میں جو حد اعتدال سے نکل گئی ہوں ہوتا ہے۔(غ)

﴿الْاَرْضِ﴾ اَرْضٌ کے مصدری معنی اَلرِّعْدَۃ یعنی کانپنا یا اَلدَّوَارُ یعنی چکر کھانا آتے ہیں۔(ت)

### زمین کا چکر کھانا:

اور ارض زمین کو کہتے ہیں گویا اس کے معنی میں ہی چکر کھانے کی طرف اشارہ ہے۔اور زمین کے خاص حصہ یا خاص ملک کو بھی کہتے ہیں۔مفردات میں ہے کہ ہر ایک چیز کے نیچے کے حصے کو اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے۔جس طرح ہر چیز کے اوپر کے حصہ کو اس کا سماء کہہ دیا جاتا ہے۔چٹائی کو، گھوڑے وغیرہ کی ٹانگوں کے نیچے کے حصہ کو، جوتی کے تلوے کے نچلے حصہ کو جو زمین سے لگتا ہے اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے۔اور مجازاً قلب انسانی پر بھی یہ لفظ بول دیا گیا ہے۔(غ)

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡٓا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے، کہتے ہیں کہ کیا ہم مان لیں جس طرح بے وقوفوں نے مان لیا۔ (25) یقیناً یہ خود ہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾

اور جب انہیں ملتے ہیں جو ایمان لائے، کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں (ان سے) ہم صرف ہنسی کرتے ہیں۔ (26)

---

**منافقوں کے فساد اور ان کے دعویٰ اصلاح سے مراد کیا ہے؟**

یہاں زمین میں فساد کرنے سے مراد ان کے خفیہ تعلقات اور سازشیں ہیں جو وہ اسلام کو تباہ کرنے کے لیے کرتے تھے یا ان کا اندر سے کفر پر قائم رہنا فساد ہے۔ ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا اس لحاظ سے تھا کہ ہم دونوں فریقوں سے صلح رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی شرارتوں سے متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ فی الواقع مفسد ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔ یہ عموماً مفسدوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کوئی من سمجھوتہ کر کے اپنے فعل کا جواز کر لیتے ہیں۔ بہتیرے دوسروں کی جڑوں کو کاٹنا اصلاح خیال کرتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ ان کے مفسد ہونے پر کسی کو اطلاع مل جائے گی۔ اور یا یہ کہ ان میں جو عامۃ الناس ہیں ان کو یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ کام اصلاح کا ہے۔ اس لیے وہ فساد کا کام کرتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ یہ فساد کا کام ہے۔

25- ﴿السُّفَهَآءُ﴾ سَفِيۡهٌ کی جمع ہے سَفَه کے اصل معنی ہلکا پن ہیں۔ کمی عقل، نفس انسانی کا ہلکا پن ہے اس لیے کم عقل یا بیوقوف آدمی کو سَفِيۡهٌ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طور پر خرچ کرنا نہیں جانتے ان کو بھی قرآن کریم نے سَفِيۡه قرار دیا ہے۔ [النسآء: 5:4]

**منافقوں کے مسلمانوں کو بیوقوف کہنے کی وجہ:**

منافق مسلمانوں کو بیوقوف اس لیے کہتے تھے کہ انہوں نے اپنے مال و دولت، گھروں، رشتہ داروں کو ایک شخص کے پیچھے لگ کر چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کفار جلدی ان کو کچل ڈالیں گے۔

26- ﴿خَلَوۡا﴾ خَلَا مکان اور زمانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلحاظ زمانہ اس کے معنی ہیں۔ مَضٰی وَذَهَبَ یعنی گزر گیا، چلا

گیا۔ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ [البقرة: 134:2] ''یہ ایک جماعت ہے جوگزر چکی۔'' ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ [آل عمران: 144:3] ''اس سے پہلے (سب) رسول مر چکے۔'' وغیرہ میں یہی مراد ہے۔اور خَلَا اِلَيْهِ يا خَلَا فُلَانٌ بِفُلَانٍ کے معنی آتے ہیں اس کے ساتھ خلوت میں ہوا۔یہی صورت اور معنی یہاں ہیں۔

﴿الشَّيْطٰنُ﴾ شَطَنَ سے ہے جس کے معنی ہیں دور ہوا۔ پس شیطان وہ ہستی ہے جو رحمت الٰہی سے دور ہوئی۔بعض نے شَاطَ (يَشِيْطُ) سے مشتق کہا ہے۔جس کے معنی ہیں غضب میں جل گیا۔قرآن شریف میں شیطان کی خلقت نار یعنی آگ سے بیان فرمائی ہے۔

## انسانوں میں سے شیطان:

قوت غضبیہ میں بڑھے ہوئے انسان بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ شیطان ہر ایک سرکش کا نام ہے جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا حیوانوں میں سے۔قرآن شریف میں بھی ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ [الانعام: 112:6] ''انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو۔'' آتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں شیطان ہوتے ہیں۔(ت)

## برے اخلاق پر شیطان کا اطلاق:

امام راغب کہتے ہیں کہ ہر ایک برے خلق کو بھی شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حسد بھی ایک شیطان ہے اور غضب بھی ایک شیطان ہے۔

## شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا:

ایک حدیث میں آتا ہے کہ شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے۔صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ میں؟ فرمایا: ہاں[إِلَّا أَنَّ اللهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ] (مسند الإمام أحمد: جلد 6، صفحه 320) صرف یہ فرق ہے کہ اللہ نے اس کے خلاف مجھے مدد دی۔پس وہ فرمانبردار ہو گیا۔جس سے معلوم ہوا کہ شیطان کو انسانوں پر نہیں بلکہ انسان کو شیطان پر تصرف دیا گیا ہے۔

## بدی کا محرک شیطان ہے:

نہایت باریک راہوں سے بری تحریک کرنے والی ہستی شیطان ہے۔اسی طرح بری تحریک کرنے والے انسان بھی شیطان ہیں۔قیامت کے دن یہی عذر گنہگاروں کا مذکور ہے کہ ہمارے سرداروں نے ہم کو بری راہ پر ڈالا اور حدیث میں جو آتا ہے [الرَّاكِبُ شَيْطَانٌ] (سنن أبي داوٗد، كتاب الجهاد، باب فِي الرَّجُلِ يُسَافِرُ وَحْدَهُ: 2609) تو وہاں مراد صرف یہ ہے کہ جب آدمی اکیلا نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

## شیطان صفت انسان:

اس جگہ شیاطین سے مراد قریباً تمام مفسرین کے نزدیک انسان شیطان ہی ہیں۔ بخاری میں امام مجاہد سے مروی ہے کہ شیاطین سے مراد ان کے منافق اور مشرک دوست ہیں۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ [رُؤَسَآئُهُمْ فِي الْكُفْرِ] ان کے کافر سردار۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ — اللہ ان کو ذلیل کرے گا(27) اور وہ ان کو مہلت دیتا ہے،

اسی سورت کی آیت 76 میں بجائے ﴿خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ کے ہے ﴿خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں شیطان صفت انسان ہی مراد ہیں۔

27- اِسْتِهْزَآءٌ کے معنی کشاف نے لکھے ہیں اِنْزَالُ الْهَوَانِ وَالْحَقَارَةِ یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا۔ کیونکہ اِسْتِهْزَآءٌ کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ مجازاً اِسْتِهْزَآءٌ سے مراد تحقیر اور ذلت کا وارد کرنا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ اِسْتِهْزَآءٌ ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر ہنسی آ جائے۔ بیضاوی میں ہے کہ اِسْتِهْزَآءٌ کی اصل هَزَأٌ ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے گویا اِسْتِهْزَآءٌ کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے۔ محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو اِسْتِهْزَآءٌ نہیں کہلاتا۔

## ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق:

اب یہ ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لیے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لیے اس لفظ میں جو آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہے۔ مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہوں گے۔ صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے۔

## اللہ کا استہزا:

یہی صورت استہزاء کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی۔ پس اللہ تعالیٰ کا استہزا صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا۔

## کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں:

عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ خود قرآن شریف میں اس کی مثالیں ہیں۔ ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: 40:42] ''' حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ [البقرۃ: 194:2] ''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا

طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۵﴾ وہ اپنی سرکشی میں حیران پھر رہے ہیں۔ (28)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى ۖ فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَ مَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۶﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو دے کر گمراہی خرید لی سو ان کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور نہ ہی وہ ہدایت پانے والے ہوئے۔ (29)

---

دو۔'' حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔ امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے۔ اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔

**سزا کا فلسفہ:**

اسی لفظ کو سزا کے لیے استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کو ضرورت جائز کرتی ہے۔ پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کے استہزاء کی سزا دے گا۔

28- ﴿يَمُدُّهُمۡ﴾ يَمُدُّ مَدّ کے اصل معنی جَرّ۔ (غ) یعنی کھینچنا یا بسط یعنی پھیلانا۔ (ت) ہیں جیسے ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ﴾ [الحجر: 88:15] ''تو اپنی آنکھوں کو نہ لگا۔'' ﴿كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ [الفرقان: 45:25] ''کس طرح سایہ کو لمبا کرتا ہے۔'' پھر اس کے معنی اِمۡهَالٌ یعنی مہلت دینا بھی آتے ہیں۔ (ت) اور مدد کرنا بھی۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ جب ایک انسان سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے جیسا جو شخص گمراہی اختیار کرے اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی معنی مروی ہیں۔ واقعات بھی اسی معنی کے مؤید ہیں کیونکہ منافقوں کو سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں غزوہ تبوک کے بعد دی گئی۔

﴿طُغۡيَانِهِمۡ﴾ طُغۡيَان طَغٰی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نافرمانی میں حد سے گزر جانا۔ (غ)

﴿يَعۡمَهُوۡنَ﴾ عَمِهَ کے معنی ہیں حیرانی کی وجہ سے کسی امر میں متردد ہونا۔

**عَمَہ اور عُمًی میں فرق:**

یہ لفظ صرف رائے کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور عُمًی یعنی اندھا پن ظاہری نابینائی اور رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔

29- ﴿اشۡتَرَوُا﴾ اِشۡتِرَاء۔ شَرٰی سے ہے۔ عموماً شِرَاءٌ کے معنی خریدنا اور بیع کے معنی بیچنا آتے ہیں۔ یعنی اول میں قیمت دینا اور چیز لینا اور دوم میں چیز دینا اور قیمت لینا ہے۔ لیکن جب چیز کے عوض چیز لی جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اِشۡتِرَاءٌ ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے۔ جس سے کچھ حاصل ہو۔ (غ)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾

ان کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اس (آگ) نے جو کچھ اس کے گرد تھا روشن کر دیا، اللہ ان کے نور کو لے گیا اور ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیا وہ کچھ نہیں دیکھتے۔(30)

---

### منافقوں کا انجام:

ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لینا یہ ہے کہ ہدایت جو ان کے پاس آئی تھی اس کو رد کر دیا اور اس کی جگہ گمراہی اختیار کر لی۔ پھر اس کو ایک تجارت قرار دے کر فرمایا: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ رِبحٌ اس فائدہ کو کہا جاتا ہے جو تجارت سے ملے۔ جس فائدہ کو انہوں نے مدنظر رکھا تھا وہ دنیوی منفعت تھی مگر وہ بھی ان کو نہ ملی۔ ﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ اور ہدایت بھی نہ ملی۔ یعنی دنیا بھی ہاتھ سے گئی اور دین بھی برباد ہوا۔ یہ ایک پیشگوئی کے رنگ میں کہا گیا تھا کہ جس دنیا کی خاطر دین کو چھوڑتے ہیں وہ بھی انہیں نہ ملے گی اور ایسا ہی حال منافقوں کا ہوا۔

30- ﴿مَثَلُهُمْ﴾ مَثَلٌ سے مراد کسی چیز کے متعلق کوئی بیان ہے جو کسی دوسری ملتی جلتی چیز کے بیان سے مشابہت رکھتا ہو تا کہ ان میں سے ایک دوسرے کو واضح کر دے۔ (غ)

﴿ظُلُمٰتٍ﴾ ظُلْمَةٌ کی جمع ہے جو روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ یہ لفظ عموماً جمع میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تاریکیاں بہت قسم کی ہیں۔ جیسے جہالت، توہم وغیرہ یا شدت ظلمت مراد ہے۔

### آگ جلانے کی مثال:

دو مثالیں بیان کی ہیں ایک اس آیت میں دوسری آیت 19 میں۔ دونوں مثالیں بحیثیت کلی ہیں۔ یعنی پہلی مثال میں آگ جلانے والا منافق نہیں بلکہ رسول ہے جیسا دوسری مثال میں بارش کی تشبیہ منافقت سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے اور مسلم میں ہے: [مَثَلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا] (مسلم، کتاب الفضائل، باب شَفَقَتِهِ ﷺ عَلَى أُمَّتِهِ وَمُبَالَغَتِهِ فِي تَحْذِيرِهِمْ مِمَّا يَضُرُّهُمْ: 6097) یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''میری مثال اس شخص کی مثال ہے کہ اس نے آگ جلائی۔'' پس اس مثال کا ماحصل یہ ہے کہ رسول نے ایک آگ روشن کی جس کے ساتھ نور پیدا ہوا اور چیزیں نظر آنے لگیں مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے وہ طاقت جس کے ساتھ انسان دیکھتا ہے گنوا دی۔ کیونکہ دیکھنے کے لیے دو نوروں کی ضرورت ہے۔ ایک انسان کے اندر کی روشنی اور دوسری بیرونی روشنی۔ سو جب اندر کا نور جاتا رہا تو ان کے لیے بیرونی روشنی بھی جو رسول نے روشن کی تھی کچھ فائدہ مند نہ ہوئی۔ روشنی اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جس کے اندر بھی نور ہو۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

بہرے، گونگے، اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے۔ (30)

اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ
رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ
اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ
اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾

یا جیسے مینہ (جو) بادل سے (برسا) اس میں اندھیرا اور کڑک اور بجلی ہے ہولناک آوازوں سے اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں دیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (31)

---

30۔ ﴿صُمٌّ﴾ اَصَمُّ کی جمع ہے۔ بہرا۔ بُكْمٌ اَبْكَمُ کی جمع ہے گونگا۔ عُمْیٌ اَعْمٰی کی جمع ہے اندھا۔ مجازی معنی مراد ہیں۔ یعنی کلمہ حق سنتے نہیں نہ کہتے ہیں۔ نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔ یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شنوائی اور بینائی سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو ہیں یا وہ جن کا نفاق محض بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔

31۔ ﴿كَصَیِّبٍ﴾ صَیِّبٍ صَوْبٌ سے مشتق ہے۔ صَوَاب وہ امر ہے جو فی ذاتہٖ پسندیدہ ہو اور صَوْبٌ یا صَیِّبٌ بارش کو کہتے ہیں جب وہ ایسے اندازے پر برسے جو موجب نفع ہو اور صَیِّبْ ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں۔ (غ)

﴿السَّمَآءِ﴾ سَمَآءٌ ہر چیز کا اس کا اوپر کا حصہ ہے۔ (غ) اس لیے محض بلندی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور سَمَآءٌ مینہ کو بھی کہتے ہیں جب تک زمین پر نہ آجائے اور سَمَآءٌ کے معنی سَحَابٌ یعنی بادل بھی ہیں۔ [اَلسَّمَآءُ السِّحَابُ] (ل)

﴿الصَّوَاعِقِ﴾ صَاعِقَةٌ کی جمع ہے جو صَعَق سے ہے اور صَاعِقَةٌ اس ہولناک آواز کو کہتے ہیں جو گرج سے پیدا ہوتی ہے اس سے مراد بعض وقت موت یا عذاب بھی ہوتا ہے۔ مگر امام راغب کہتے ہیں کہ یہ چیزیں اس کی تاثیرات میں سے ہیں۔ پس اصل معنی اس کے ہولناک آواز کے ہی ہیں اور زلزلہ کے ساتھ یا آندھی میں جو ہولناک آواز آتی ہے اس پر بھی قرآن شریف میں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

## بارش کی مثال:

اس تمثیل میں صَیِّبْ یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الٰہی ہے۔ اندھیرے سے مراد وہ مشکلات ہیں جو وحی الٰہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔ کڑک سے مراد بعض خوفناک امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔ چمک سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کے منافق ہیں جو بالکل اپنی روشنی نہیں کھو چکے مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔ کوئی مشکلات سامنے آجاتی ہیں تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے کچھ تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب مارے گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے: ﴿یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ﴾ [المنافقون: 4:63] ''وہ ہر زور کی آواز کو اپنے اوپر (تباہی) خیال کرتے ہیں۔'' اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ
اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ
عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
ع 2 13 2 شَیْءٍ قَدِيْرٌ ؑ ۝۲۰

قریب ہے کہ بجلی ان کی نظر کو اچک لے جائے، جب کبھی وہ ان کو روشنی دیتی ہے اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کرتی ہے ٹھہر جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور ان کی شنوائی اور ان کی بینائی کو لے جاتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (32)

---

ہے کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

32- ﴿لَوْ﴾ بعض وقت محض حرف شرط کا کام دیتا ہے۔ یہاں بھی محض اگر کے معنی میں ہے۔

﴿شَآءَ﴾ مَشِيْئَةٌ اور ارادہ بعض کے نزدیک یکساں ہیں مگر بعض کے نزدیک مشیت کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے اور اللہ کی مشیت ایجاد شے ہی ہے اور انسان کی مشیت [إِصَابَةُ الشَّيْءِ] ہے یعنی ارادہ کے ہم معنی۔ اسی معنی کی رو سے درست ہے جو کہا گیا ہے: [مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ] جو اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے۔ پس اللہ کی مشیت وجود شے کی مقتضی ہے۔ (غ)

﴿شَیْءٍ﴾ بعض کے نزدیک شَیْءٌ وہ چیز ہے جو جانی جائے اور جس کی خبر دی جائے۔ (ر) اور ﴿شَیْءٍ﴾ اصل میں شَآءَ کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول ہے یعنی چاہی گئی چیز۔

﴿قَدِيْرٌ﴾ قُدْرَةٌ سے ہے اور جب یہ انسان کی صفت ہو تو مراد اس سے ایسی حالت ہے جس میں انسان کسی چیز کے کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو مراد اس سے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی ہوتی ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے قدرت مطلقہ کا لفظ دوسرے پر بولا نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں امر پر قادر ہے اور قَدِيْرٌ کے معنی ہیں: [اَلْفَاعِلُ لِمَا يَشَآءُ عَلٰى قَدَرِ مَا تَقْتَضِي الْحِكْمَةُ لَا زَائِدًا عَلَيْهِ وَلَا نَاقِصًا عَنْهُ] (المفردات للراغب: جلد1، صفحہ 394) یعنی کرنے والا اس کا ہے جسے وہ چاہے اس اندازے پر جو حکمت کا اقتضاء ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ (غ)

پچھلی آیت میں جب یہ بیان کیا کہ کافر اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اسلام کامیاب ہوگا، تو اب بتایا کہ اسلام کی کامیابیاں تو ایسی ہوں گی کہ آنکھوں کو چندھیا دیں گی۔

## کمزور دل منافق:

مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی کامیابی دیکھتے ہیں تو کچھ قدم آگے اٹھانا چاہتے ہیں لیکن پھر مشکلات نظر آتی ہیں پھر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہی حالت منافقوں کی تاریخی واقعات سے نظر آتی ہے۔ کامیابی دیکھتے تو مسلمانوں کے ساتھ ملاپ زیادہ ظاہر کرتے،

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا

تکلیف دیکھتے تو طرح طرح کی باتیں اسلام کے خلاف بنانے لگتے۔ ان کی روشنی پہلی مثال کے منافقوں کی طرح بکلی نہیں جاتی رہی۔ اس لیے یہ آخرکار راہ راست پر آ جائیں گے۔

**صفاتِ الٰہی اور صفاتِ مخلوق میں کامل و ناقص کا مابہ الامتیاز:**

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام صفات جو اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ اس کی مخلوق کی بھی صفات ہیں۔ مگر مخلوق کبھی کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اشتراک کامل سے شرک پیدا ہوتا ہے۔ مخلوق میں وہ صفات ناقص طور پر موجود ہیں اور خالق میں کامل طور پر۔ مثلاً انسان میں بھی سننے کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ میں بھی۔ اور انسان میں بھی دیکھنے کی صفت ہے اللہ تعالیٰ میں بھی۔ مگر انسان کے سننے اور دیکھنے کو اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے سے کوئی نسبت نہیں۔

**خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے:**

اسی طرح انسان میں بھی قدرت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے وہ ہیچ ہے۔ انسان میں بھی مشیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس پر غالب ہے۔ انسان کی صفات ایک تنگ اور محدود دائرہ میں کام کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات تمام حد بندیوں اور تمام قیود سے پاک ہیں۔ یہ ایک اصول ہے جو صفات الٰہی کے سمجھنے میں بڑا کام دیتا ہے۔ ہم جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے ماتحت ہیں، اسی طرح اس کی مشیت کے بھی ماتحت ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت نہ ہوں تو ہماری مشیت بھی اس کی مشیت کی طرح کامل ہوگی اور یہ شرک ہے۔

**توحید پر دلائل:**

**قادر مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب:** اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر یہ اعتراض آریہ سماج کی طرف سے ہوا ہے کہ پھر وہ اپنے جیسا قادر مطلق خدا بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اپنی مملکت سے کسی کو خارج کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ امور اس صفات کاملہ کے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ ایسا نہیں کرتا۔ قدرت کا سوال ہی اس بات پر آتا ہے جو اس کی صفات کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص اتنا امیر ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے پہنے تو یہ ایک احمقانہ سوال ہوگا کہ کیا وہ غلاظت کھا سکتا ہے یا گندے چیتھڑے پہن سکتا ہے؟ علاوہ ازیں لفظ قدیر اختیار کر کے قرآن شریف نے خود بتایا ہے کہ اس کی قدرت ان چیزوں پر ہے جو وہ چاہتا ہے۔ یعنی جو اس کے صفات کے تقاضا کے خلاف نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے قادر مطلق خدا کا ہونا یا اس کی مملکت سے باہر کسی اور مملکت کا ہونا اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف ہے اور اس لیے شئ کا اطلاق ہی اس پر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آج سے سینکڑوں سال پیشتر جب ان اعتراضات کا نام ونشان نہ تھا اس وقت بھی قدیر کے معنی آئمہ لغت نے یہی کیے کہ ہر چیز کا کرنے والا جسے وہ چاہے اور اس اندازے پر جو اقتضائے حکمت کے مطابق ہو، نہ اس سے زیادہ ہو اور نہ کم۔ پس خود لغت ہی ان اعتراضات کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔ (33)

---

33- ﴿خَلَقَكُمْ﴾ خَلَقَ کے اصل معنی [اَلتَّقْدِيْرُ الْمُسْتَقِيْمُ] ہیں یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے: [أَوَّلٌ فِيْ إِبْدَاعِ الشَّيْءِ مِنْ غَيْرِ أَصْلٍ وَلَا احْتِدَاءٍ] یعنی ایک چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ کوئی نمونہ ہے۔ جیسے فرمایا ﴿خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [البقرة: 2:164] ''آسمانوں اور زمین کی پیدائش۔'' کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [البقرة: 2:117] ''مادہ کے بغیر آسمانوں اور زمین کا بنانے والا۔'' (جس سے معلوم ہوا کہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے۔)

**خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے:** اور دوسرا ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ [النحل 4:16] ''انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔'' اور وہ خَلَقَ جو بمعنی ابداع ہے یعنی نیستی سے ہستی کرنا وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ (غ) پس معلوم ہوا کہ لفظ خَلَقَ کا استعمال زبان عرب میں دونوں طرح پر ہے۔ نیستی سے ہستی کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز کے بنانے پر بھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ﴿خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ بھی کہا ہے اس لیے جہاں تک بھی یہ سلسلہ چلایا جائے کہ فلاں چیز فلاں سے بنی اور فلاں فلاں سے آخر جہاں تک علم انسانی پہنچ سکتا ہے اس کا خالق بھی وہی ہے۔ پس وہ نیستی سے ہستی کرنے والا ہوا۔

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت کا ذکر ہے۔ اور انسان کو اس عظمت کے سامنے سر جھکانے کا حکم ہے اور اس سے اگلے رکوع میں انسان کے مقام کو بلند کرنے کا ذکر ہے کہ اس کو کس قدر تسلط کائنات پر حاصل ہے۔ بتایا کہ خدا کے آگے عاجزی اختیار کر کے وہ سب کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

## عبادت اور اطاعت میں فرق:

سب سے پہلا حکم جو قرآن کریم میں دیا جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ یعنی اپنے قویٰ کو اس کی فرمانبرداری میں لگا دینا اس طرح پر کہ انسان کی حالت خضوع کی ہو۔ اطاعت کے لیے خضوع ضروری نہیں، عبادت کے لیے ہے۔ اس لیے اطاعت دوسروں کی بھی ہوسکتی ہے مگر عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کی جائز نہیں۔ پھر انسان کے وہ تمام کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہوں عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حفاظت دین کے لیے صحابہ کا جنگیں کرنا بھی عبادت میں داخل تھا۔

## خلق سے توحید الٰہی پر دلیل:

جو پیدا کرنے والا ہے عبادت اسی کی ہونی چاہیے نہ اس کے غیر کی۔ اور سب مذاہب کا اتفاق ہے کہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پس اس میں توحید الٰہی پر بھی دلیل ہے۔

## عبادت سے حصول کمال:

رب کی عبادت کرو۔ اور رب وہ ہے جو انسان کو اس کے کمال حقیقی تک اور اس کی پیدائش کی علت غائی کے حصول تک پہنچاتا

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا اور آسمان کو عمارت[34] اور اوپر سے پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ تمہارے لیے پھلوں سے رزق نکالا۔[35] پس تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ اور تم جانتے ہو۔[36]

---

ہے۔اس کی عبادت کے حکم میں اشارہ یہ ہے کہ بدون عبادت الٰہی تم اس کمال کو حاصل نہیں کر سکتے اور یہ کہ ایک اللہ کی عبادت ہی کمالات کے حصول تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔اس لیے اس کا نتیجہ ﴿تَتَّقُوْنَ﴾ فرمایا اور اِتِّقَآءٌ ضرر رساں اشیاء سے بچنا یا حقوق کی نگہداشت کرنا ہے۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے وہ کمال انسانی کو پہنچنا تو ایک طرف رہا حقوق انسانی کی بھی پوری نگہداشت نہیں کر سکتے۔آج یورپ کی اقوام کیوں آدھی نسل انسانی کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں۔اس لیے کہ خدا کی عبادت نہیں کرتیں بلکہ سونے کی اور حکومت کی پرستش کرتی ہیں۔

34- ﴿فِرَاشًا﴾ فِرَاشٌ کے معنی مَفْرُوْشٌ یا پھیلائی ہوئی چیز ہیں کیونکہ فرش کے معنی بسط یا پھیلانا ہیں۔راغب کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ ایسا بنایا جس پر انسان قرار پکڑ سکتا ہے۔

﴿بِنَآءً﴾ بمعنی مبنیٰ یا بنائی گئی چیز کے ہے۔(غ) یعنی عمارت۔تنکیر عظمت کے لیے ہے۔

## خلق سے دلیل:

اگر خلق انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہے تو زمین و آسمان کی بناوٹ اس کی عظمت کا اور بھی بلند احساس پیدا کرتی ہے۔بعض نے بناء کے معنی ڈیرہ یا خیمہ کیے ہیں۔اس صورت میں ظاہری تشبیہ مراد ہے اور آسمان کو عمارت کہنے سے یہ مراد ہے کہ سب کچھ ایک نظم کے ماتحت ہے۔جیسے عمارت میں ایک ترتیب ہوتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے بنانے والی ایک مدبر بالا رادہ ہستی ہے۔زمین کے فراش یا بچھا یا ہوا ہونے یا انسان کی قرار گاہ ہونے میں اس کی کرویت کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

35- **نظارۂ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ:** آسمان سے پانی برسنا اور اس کے ساتھ زمین سے پھلوں کا نکلنا۔اس میں بتایا کہ زمین جو پستی کا مظہر ہے آسمان سے جو بلندی کا مظہر ہے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو عبادت میں لگا کر پستی کا مظہر بناتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور فطرت انسانی کی مخفی قوتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں گویا جو کچھ نظارہ قدرت میں نظر آتا ہے۔وہی فطرت انسانی میں موجود ہے۔اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب تک وحی الٰہی سے بندوں کو ہدایت نہ ملے جو اوپر کے پانی سے مشابہت رکھتی ہے اندرونی استعدادیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔اسی تعلق کے لحاظ سے اگلی آیت میں کھول کر وحی الٰہی کا ذکر کیا ہے۔

36- ﴿اَنْدَادًا﴾ نِدٌّ کی جمع ہے اور ند کسی چیز کا وہ ہے جو اس کے جوہر یعنی اصل میں شریک ہو۔(غ) یا اس کی مثل اور اس کی ضد ہو۔(ت)

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ۔ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔(37)

---

## شرک فی العبادت شرک فی الذات ہے:

عبادت یا دیگر امور میں دوسروں کو شریک کرنا ان کو اللہ کی ذات میں ہی شریک کرنا ہے۔ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کے سامنے کہہ دیا تھا [مَا شَآءَ اللّٰهُ، وَشِئْتَ] جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: [أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ نِدًّا؟] (مسند أحمد: جلد4، صفحہ 341) ''کیا تم مجھے اللہ کا شریک کرتے ہو۔'' صرف ماشاء اللہ کہو کیونکہ اسی کی مشیت سب مشیتوں پر غالب ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم جانتے ہو تو مراد یہ ہے کہ اس بات کو جانتے ہو کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ بت وغیرہ نہیں ہیں۔ پھر بتوں کو پرستش میں شریک کرتے ہو اور ایک اصول کو مان کر خود اس کے خلاف چلتے ہو۔

37- ﴿بِسُوْرَةٍ﴾ سُوْرَةٌ اصل میں بلند منزل یا بلند مقام کو کہتے ہیں۔ (غ) اور سُور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی سورت کو سورت یا تو اس لیے کہا کہ اس کا مقام بلند ہے اور یا اس لیے کہ جس طرح فصیل شہر کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سورت مضامین کا احاطہ کرتی ہے۔ (غ) اور ہر سورت بجائے خود ایک کامل کتاب ہے اور عرف میں قرآن کریم کا ایک حصہ ہے جو دوسروں حصوں سے بسم اللہ کے ذریعہ ممیز ہے۔ قرآن کریم میں کل 114 سورتیں ہیں۔ اسی مادہ سے قرآن کریم میں اساور کڑوں کے معنی میں اور تَسَوَّرُوْا انہوں نے دیوار پھاندی کے معنی میں آئے ہیں۔

﴿شُهَدَآءَكُمْ﴾ شُهَدَآءُ۔ شَهِيْدٌ کی جمع ہے اور شُهُوْدٌ اور شَهَادَةٌ حاضر ہونا ہے دیکھنے کے ساتھ۔ آنکھ سے ہو یا بصیرت سے اور کبھی محض حاضر ہونے کو بھی کہتے ہیں۔

## شہید صفات باری میں:

لفظ شَهِيْدٌ مختلف معنی میں آیا ہے اللہ کی صفات میں بھی شہید ہے اور یہ بلحاظ اپنے کمال کے ہے یعنی وہ جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں۔ (ت) یا اَلْعَلِيْمُ محض علم کے لحاظ سے ہے اور اَلْخَبِيْرُ امور باطنی کے لحاظ سے اور اَلشَّهِيْدُ امور ظاہری کے لحاظ سے۔

## شہید کون کون ہیں؟

انبیاء علیہم السلام کو اپنی اپنی امتوں پر شہید کہا گیا ہے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ کوئی شخص فضیلت رکھتا ہے اسی قدر زیادہ شہادت دینے کا اہل ہے جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کو بھی شہید کہا گیا ہے۔ اور بالآخر اسے بھی جو اللہ کی راہ میں مارا جائے بلکہ

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ

پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا اور ہرگز نہ کرسکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں یہ کافروں

---

حدیث میں جلے ہوئے، مبطون، غریق وغیرہ کو بھی شہید کہا گیا ہے۔ یہاں شُھَدَاء کے معنی میں مختلف روایات ہیں بعض کے نزدیک مددگار مراد ہیں۔ بعض نے معبودان باطل، بعض نے حُکَّامُ الْفُصَحَاءِ مراد لیے ہیں اور بعض کے نزدیک آئمہ یعنی پیشرو مراد ہیں۔

## رازِ توحید وحی نے کھولا ہے:

توحید الٰہی کا اصل راز وحی الٰہی نے ہی کھولا ہے۔ اس لیے پچھلی آیت میں وحی الٰہی کی طرف اشارہ کرکے اب اس کامل وحی کا ذکر کرتا ہے جس نے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہو کر حقیقی توحید کی راہ دنیا کو دکھائی۔ اس آیت میں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ دلیل دی ہے کہ یہ ایک بےنظیر کتاب ہے جس کی مثل کوئی نہیں بنا سکتا۔

## قرآن کی مثل کا مطالبہ:

یہ دعویٰ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے۔ کہیں اس رنگ میں کہ اس قرآن کی مثل لاؤ۔ کہیں یوں کہ دس سورتیں اس کی مثل بنا کر دکھاؤ اور آخری اور اقل مطالبہ یہ ہے کہ ایک ہی سورت اس کی مثل بنا کر لے آؤ۔ یہ تصریح نہیں کہ کس بارہ میں مثل ہو۔

## مثل تین باتوں میں چاہیے:

ایک کتاب یا کلام کا بےمثل ہونا تین باتوں میں ہوسکتا ہے۔ الفاظ کی ظاہری بندش کے لحاظ سے کمال اور جامعیت مضامین میں اور اس اثر کے لحاظ سے جو اس کلام سے پیدا ہو۔

## فصاحت و بلاغت قرآن:

فصاحت و بلاغت میں قرآن کریم کا بےمثل ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ یہ زبان عربی میں فصاحت و بلاغت کا معیار مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت نازل ہوا جب عربی زبان میں نثر کا رواج نہ تھا۔ بلحاظ کمال مضامین یہ حالت ہے کہ نہ صرف تمام مذاہب کے اصول باطلہ کی تردید کرتا اور اصول حقہ کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ بلکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے اصول کو بھی بیان کرتا ہے۔ پھر جس بات کا دعویٰ کرتا ہے اس کے دلائل بھی ساتھ دیتا ہے۔

## جامعیت مضامین قرآن:

بلحاظ جامعیت مضامین چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہے کہ ایک خاص مضمون کو کمال تک پہنچاتی ہے اور **ایک کتاب کا حکم رکھتی ہے**۔ مگر سب سے واضح معیار مثل ہونے یا نہ ہونے کا یہ ہے کہ جو کام اس کتاب نے کرکے دکھایا ہے وہ دوسری کسی کتاب نے کرکے نہیں دکھایا اور چونکہ اس سورت کی ابتدا اس دعویٰ سے کی تھی کہ یہ کتاب ہدایت ہے۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ کے لیے تیار کی گئی ہے۔(38)

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اور انہیں خوش خبری دے دو جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے باغ ہیں، جن کے نیچے

---

**ہدایت دینے میں بے نظیر:**

پس اسی میں بے مثل ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ یعنی کوئی ایسی کتاب یا سورت لاؤ جو دنیا کے لیے اسی طرح موجب ہدایت بنی ہو۔ قرآن کریم نے جو انقلاب دنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت پستی کی حالت سے ایک قوم کو اٹھا کر اوج کمال تک پہنچایا اس کے متعلق دنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا کام کسی اور کتاب نے کر کے نہیں دکھایا۔

38- یہاں پیشگوئی کی ہے کہ اس کتاب کی مثل کبھی کوئی نہ بنا سکے گا اور اس کی صداقت آج آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ باوجود ایسی کھلی دلیل کے جو شخص توحید کو چھوڑتا اور بت پرستی اختیار کرتا ہے اس کا انجام آگ ہے۔ یہاں دوزخ کی آگ کے متعلق فرمایا کہ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ گویا شرک یا بت پرستی سے ہی یہ پیدا ہوتی ہے اور سارے گناہ شرک کی ہی فروع ہیں۔ جس طرح ساری نیکیوں کی جڑ توحید ہے۔

**پتھر کن معنوں میں دوزخ کا ایندھن ہیں:**

پتھروں سے مراد یہاں معبودان باطل ہیں یا جیسا کہ امام راغب نے ایک قول نقل کیا ہے۔ مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سخت دل ہیں جیسے پتھر۔ اسی کی طرف ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرة: 74:2] ''سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر۔'' میں اشارہ ہے اور عربی میں بڑے ہیبت ناک آدمی کو بھی حجر کہا جاتا ہے۔ جس پر دوسرے کی بات کا اثر نہ ہو۔ پس ہوسکتا ہے کہ یہاں اَلْحِجَارَةِ سے مراد وہ قسی القلب لوگ ہوں جو ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرة: 7:2] ''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔'' کے مصداق ہیں اور اَلنَّاسُ سے مراد عام لوگ۔ لوگوں کا دوزخ کا ایندھن ہونا بتاتا ہے کہ دوزخ انسان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ایندھن یعنی جس سے یہ آگ جلتی ہے خود انسان ہیں کچھ اور نہیں۔

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ میں بتایا کہ وہ کفر سے ہی تیار ہوتی ہے۔ مسلمان میں جس قدر حصہ کفر کا ہے اسی قدر اس کے لیے دوزخ ہے۔

**دوزخ پر فنا:**

یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس بات کے قائل ہیں کہ دوزخ پر آخر فنا آجائے گی۔ جیسا کہ ابن تیمیہ نے یہ قول ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ کیونکہ روایات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ پر ایک زمانہ ایسا زمانہ آئے گا جب اس میں کوئی نہ رہے گا۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ

نہریں بہتی ہیں (39) جب کبھی ان کو ان میں سے کوئی پھل رزق دیا جائے گا، کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا،

---

پس جب کوئی انسان اس میں نہ رہا اور اس کا ایندھن ختم ہو گیا تو وہ آگ بھی فنا ہو جائے گی۔ اس پر مفصل بحث سورہ ہود میں آئے گی۔

39- ﴿جَنّٰتٍ﴾ جَنَّةٌ کی جمع ہے جو جَنَّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا حواس ظاہری سے مخفی رکھنا۔ (غ) اور جَنَّةٌ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اسکی زمین کو ڈھانک لیا ہو۔ (غ) لفظ جنت صرف باغ کے معنی میں بھی قرآن شریف میں آیا ہے اور بہشت کو بھی جَنَّةٌ کہا ہے یا تو اس لیے کہ اس کو دنیا کے باغوں سے تشبیہ دی ہے۔ (غ) اور بہشت کا نقشہ جو قرآن کریم نے کھینچا ہے وہ گویا بطور مثال ہے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ [الرعد: 35:13۔ محمد: 15:47] ''جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے۔'' سے بھی ظاہر ہے اور یا اس لیے کہ جنت کی نعمتیں انسان کے حواس ظاہری سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ (غ) جیسا کہ لفظ جَنَّ کے اصل معنی بتاتے ہیں اور قرآن کریم نے اس اخفا کو دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [السجدة: 17:32] ''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔''

﴿الْاَنْهٰرُ﴾ نَهْرٌ کی جمع ہے یعنی وہ مقام جہاں سے پانی بافراط بہتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے لیے جو جنت میں لوگوں کو اس کے فیض اور فضل سے بافراط ملے گا اور ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ [الفرقان: 10:25] ''جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔'' میں اور ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ﴾ [القمر: 54:54] ''متقی باغوں اور فراخی میں ہوں گے۔'' میں ان کے نزدیک یہی مراد ہے۔

## ربط:

جب آگ کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو اس کے مقابل پر مومنوں کا اور ان کی آئندہ حالت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے، اس کے احکام کی فرمانبرداری سے بجائے آگ کے باغ اور نہریں بنتی ہیں۔

## بہشت کے باغ اور نہریں:

قرآن کریم نے بہشتی زندگی کا نقشہ بسا اوقات ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ جنات یعنی باغوں میں ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یا کہیں فرمایا کہ وہ باغوں میں اور نہر میں ہوں گے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آئندہ زندگی کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے وہ محض بطور مثال بیان ہوا ہے اور ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ [الرعد: 35:13۔ محمد: 15:47] ''جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے۔'' میں یہ صراحت موجود ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن کثیر میں روایت موجود ہے: [لَا يَشْبَهُ شَيْءٌ مِمَّا فِي الْجَنَّةِ مَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا فِي الْأَسْمَآءِ]

مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور انہیں ملتا جلتا (رزق) دیا جائے گا، اور ان کے لیے ان میں پاک ساتھی ہوں گے اور وہ انہی میں رہیں گے۔ (39ا)

(تفسیر ابن کثیر: جلد1، صفحہ205) یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جنت کی نعماء انسان کی اس آنکھ سے اور اس کے ظاہری حواس سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ اس پر اول تو خود لفظ جنت کے معنی سے شہادت ملتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پھر قرآن شریف میں صراحت سے ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾[السجدة: 17:32] یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی نعمت مخفی رکھی گئی ہے اور حدیث صحیح میں اس سے بھی زیادہ صراحت ہے جہاں اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [قَالَ اللّٰهُ: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَآ أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ] (صحيح البخاری، بدء الخلق، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ: 3244) اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل پر وہ گزرا۔ جنت کی نعماء کا جہاں ذکر ہو اس میں ان دونوں باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ فی الواقع جنات سے مراد ایسے باغ تو نہیں جیسے یہاں ہیں اور نہ نہروں سے مراد ایسی ہی پانی کی نہریں ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ اس حقیقت کا علم وہیں ہوگا۔

39-ا) ﴿مُتَشَابِهًا﴾ شِبْهٌ سے ہے اور اس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے۔

﴿اَزْوَاجٌ﴾ زَوْجٌ کی جمع ہے۔ حیوانات میں جن کے جوڑے ہوتے ہیں، جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کا زَوْجٌ کہا جاتا ہے اور غیر حیوانات میں اور حیوانات میں بھی ہر ایک کو جو دوسرے کا قرین یعنی ساتھی ہو اس کا زَوْجٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) چنانچہ ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ﴾[الصافات: 22:37] ''اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو۔'' میں اور ﴿هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ﴾[یٰسٓ: 56:36] ''وہ اور ان کے جوڑے سایوں میں ہوں گے۔'' میں امام راغب نے ازواج کے معنی کیے ہیں ان کے ساتھی جنہوں نے ان کے افعال میں ان کا اقتدا کیا۔

﴿مُّطَهَّرَةٌ﴾ طَهَارَةٌ بمعنی پاکیزگی سے ہے اور طہارت دو طرح پر ہے جسم کی اور نفس کی۔ (غ) چنانچہ یہاں ﴿اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ کے معنی انہوں نے یوں کیے ہیں کہ دنیا کی آلائشوں اور اس کی نجاستوں سے پاک یا برے اخلاق سے پاک کیے گئے۔ قتادہ سے ہے گناہ اور اذی سے پاک کیے گئے۔ (ج)

﴿خٰلِدُوْنَ﴾ خُلْدٌ سے ہے اور خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا فساد کے واقع ہونے سے بری رہنا اور اس کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہو۔ (غ) اور [خُلُوْدٌ فِي الْجَنَّةِ] کے معنی امام راغب کے نزدیک یہی ہیں یعنی اشیاء کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہیں بغیر اس کے کہ ان میں فساد واقع ہو۔ بالفاظ دیگر وہاں تنزل نہیں جس طرح اس دنیا میں ہے اور ہمیشگی کے معنی اس میں بطور استعارہ ہیں۔ (غ) اور روح المعانی میں ہے کہ خلود معتزلہ کے نزدیک بقائے دوام یا ہمیشہ رہنا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا اور اہل سنت کے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ

اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے، مچھر کی اور اس سے بڑھ کر (40) سو جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے سچ ہے

---

نزدیک بقائے طویل یعنی زمانہ دراز تک رہنا ہے خواہ منقطع ہو جائے خواہ نہ ہو۔

**جنت کے پھلوں کے متعلق** یہ کہنا کہ یہ وہ ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں دیا گیا۔ مراد جسمانی پھل تو ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ پھل تو سب مومنوں کو دنیا میں ملتے نہیں۔ پس مراد اعمال حسنہ کے ثمرات ہیں جن کو روحانی طور پر مومن یہاں بھی پالیتا ہے اور متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ گو وہ آخرت کے پھل الگ ہوں گے مگر اعمال حسنہ کے مشابہ ہوں گے جس طرح بدی کی سزا اس کی مثل ہے اسی طرح نیکی کا پھل بھی اس عمل نیک سے ملتا جلتا ہے۔

**بہشت میں ازواج:**

جنت میں ازواج بھی ہوں گے۔ ازواج کے صاف معنی تو ساتھی ہیں جیسے: ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ﴾ [الصافات: 22:37] ''اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو۔'' میں مومن مرد اور مومن عورتوں دونوں ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ میں شامل ہیں۔ دونوں کے لیے بہشت کی نعماء ہوں گی۔ دونوں کے لیے باغ اور نہریں ہوں گی دونوں کے لیے ازواج مطہرہ یعنی پاک ساتھی ہونے چاہئیں۔ اگر بیبیاں بھی مراد لی جائیں تو بہشت میں ان کا ہونا کوئی امر قابل اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ [الذاریات: 49:51] ''اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے۔'' اور گو جوڑے پیدا کرنے کی ایک غرض اس دنیوی زندگی میں سلسلہ توالد وتناسل بھی ہے۔ مگر مرد عورت کے جوڑے کی اور اغراض بھی ہیں وہ ایک دوسرے کے لیے تسکین وراحت کا موجب ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ ان پاک تعلقات کے جنت میں ہونے پر کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اور بہرحال اس بات کو تو سب نے مانا ہے کہ جنت کی نعماء کی حقیقت وہ نہیں جو اس دنیا کی ہے گو ناموں میں اشتراک ہو اور اَزْوَاجٌ کے ساتھ مُطَهَّرَةٌ کا لفظ بڑھا کر بتایا کہ یہ رفاقت تمام الائشوں سے پاک ہے اس پاک رفاقت پر اعتراض کرنا ناپاکوں کا کام ہے۔

40- ﴿يَسْتَحْيٖ﴾ اس کا مادہ حیی ہے جس سے حَيَاةٌ بمعنی زندگی بھی ہے اور حیاء کے اصل معنی ہیں بری باتوں سے رکنا اور ان کا ترک کرنا اور یہی معنی اِسْتِحْيَاءٌ کے ہیں۔ (غ) اسی لیے حیا کو ایمان سے کہا ہے کیونکہ وہ بری باتوں یعنی معاصی سے روکتا ہے اچھے کام سے رکنے کا نام حیا نہیں۔

﴿بَعُوْضَةً﴾ بعض سے مشتق ہے دوسرے حیوانات کے مقابل میں اس کے جسم کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بَعُوْضَةٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) عربی زبان میں غایت درجہ کی کمزور چیز کی مثال مچھر سے دی جاتی ہے۔ ان کی امثال میں ہے: [أَضْعَفُ مِنْ بَعُوْضَةٍ] (كتاب جمهرة الامثال، جلد2 صفحه 3) یعنی مچھر سے بھی زیادہ کمزور۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًاۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا١ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا١ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَۙ۝۲۶

وقف لازم

اور جنہوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں اللہ نے اس مثال سے کیا چاہا ہے؟ وہ بہتیروں کو اس سے گمراہ ٹھہراتا ہے اور بہتیروں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھہراتا۔ (41)

---

## مچھر کی مثال:

اصل مضمون رکوع کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ہے اسی کی تائید میں قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔ رکوع کے اول و آخر میں بھی یہی مضمون ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو معبودان باطل کی مثالیں کہیں مکڑی سے اور کہیں مکھی سے دی ہیں تو یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ حق کے بیان کرنے سے نہیں رکتا۔ مکڑی کی مثال سورہ عنکبوت میں دی ہے۔ جہاں فرمایا کہ ''جو لوگ اللہ کے سوائے اولیاء بناتے ہیں تو ان کی مثال مکڑی کے گھر کی ہے جو سب گھروں میں کمزور ہے۔'' یعنی ادھر بنتا ہے ادھر بگڑتا ہے۔ [العنکبوت: 29:41] اور مکھی کی مثال یوں دی ہے کہ ''سارے معبودان باطل ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ مکھی ان سے کچھ لے جائے تو اسے بھی واپس نہیں لے سکتے۔'' [الحج: 73:22] معبودان باطل کی ان مثالوں کو کفار برا مناتے تھے تو فرمایا کہ کمزور سے کمزور شے کی مثال بھی باطل معبودوں کی عاجزی کے اظہار کے لیے غیر محل نہیں حتیٰ کہ مچھر کی مثال بھی جس کو سب سے زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے اور یا چونکہ اوپر جنت کا ذکر تھا اور وہ بھی ایک مثال ہے اس لیے فرمایا کہ ان نعماء کو سمجھانے کے لیے اس دنیا کی چیزوں سے ان کی مثال دینے میں حرج نہیں۔

41- ﴿یُضِلُّ﴾ امام راغب لکھتے ہیں کہ اضلال دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ اضلال نتیجہ ہو گمراہ ہو جانے کا مثلاً اگر کسی کا اونٹ گم ہو جائے تو وہ کہے گا: [أَضْلَلْتُ الْبَعِیْرَ] اب اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اونٹ کو گمراہ کر دیا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ میرا اونٹ گمراہ ہو گیا یعنی گم ہو گیا۔ اسی طرح کسی پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا جائے یعنی اس کے متعلق کہا جائے کہ وہ گمراہ ہو گیا تو بھی أَضْلَلْتُهُ کہہ دیں گے۔ جیسے اس شعر میں: [فَمَا زَالَ شُرْبِي الرَّاحَ حَتَّى أَضَلَّنِيْ ... صَدِيْقِيْ وَسَآءَ فِي بَعْضِ ذٰلِكَ] یعنی میں شراب پیتا رہا یہاں تک کہ میرے دوست نے مجھے گمراہ قرار دیا۔ حالانکہ لفظ اضل استعمال کیا ہے مگر مراد یہ نہیں کہ گمراہ کر دیا بلکہ گمراہ کہا۔ اور دوسرا یہ کہ اضلال کا نتیجہ گمراہی ہو یعنی ایک شخص دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جائے۔ مثلاً باطل کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ اضلال پہلے معنی میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے یا دوسرے معنی میں۔ دوسرے معنی میں منسوب کرنے سے یہ مراد ہوگی کہ خدا تعالیٰ انسانوں کے سامنے باطل باتوں کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں، یہ بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کو اچھے پیرایوں میں بیان کرتا ہے اور ان کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ پس لازماً پہلے معنی میں لفظ لیا جائے گا اور مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ پا کر گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

جو اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔(42)

---

لگا تا ہے۔ یعنی ان کی گمراہی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا گمراہ ہونے کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ لغت حدیث میں بھی ہے کہ أَضْلَلْتُهُ کے معنی اس طرح پر آتے ہیں جیسے أَحْمَدْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس کو محمود پایا اور أَبْخَلْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس کو بخیل پایا۔ اسی طرح أَضْلَلْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے گمراہ پایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: [أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى قَوْمًا فَأَضَلَّهُمْ] جس کے معنی ہیں کہ نبی ﷺ ایک قوم کے پاس آئے اور ان کو گمراہ پایا۔ یہ معنی نہیں کہ ان کو گمراہ کر دیا۔ (ن)

﴿الْفٰسِقِيْنَ﴾ فَاسِقٌ۔ فَسَقَ سے ہے جس کے معنی شریعت کی روک سے نکل گیا گویا ایک عہد کر کے اس سے پھر گیا کیونکہ قبولیت شریعت ایک عہد ہے اور فسق تھوڑے اور بہت ذنوب دونوں پر بولا جاتا ہے۔ مگر عرف شریعت میں کثرت پر بولا جاتا ہے۔ یعنی جب ایک شخص بہت زیادہ خروج عن الشریعت کرے تو اسے فاسق کہا جاتا ہے اور کفار کو جو فاسق کہا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ وہ زیادہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس عہد کو توڑتے ہیں جو انسان کی فطرت میں مرکوز ہے۔ (غ) اور یہ شرعی اصطلاح ہے۔ فاسق کا لفظ کلام عرب میں انسان کی وصف میں نہ بولا جاتا تھا۔ (غ) یہاں ﴿مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾ کہہ کر یہ بتا دیا کہ اضلال کے معنی گمراہ پانا یا گمراہی میں چھوڑ نا ہیں۔ کیونکہ فاسق تو خود ہی پہلے گمراہ ہے اسے اور گمراہ کیا کرنا ہے۔ کیونکہ فاسق اس کو کہتے ہیں جو شریعت یعنی قانون کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے تو وہ خود گمراہ ہو چکا ہوا ہے۔ یہ دوسرا قرینہ ہے کہ اضلال کے معنی یہاں گمراہ ٹھہرانا یا گمراہی میں چھوڑ دینا ہیں۔

42- ﴿عَهْدَ اللّٰهِ﴾ عَهْدٌ وہ اقرار موثق ہے جس کی حفاظت کرنی ضروری ہو۔ راغب لکھتے ہیں کہ عہد اللہ یعنی اللہ کا عہد کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک بات ہماری عقل میں ودیعت کر رکھی ہے اور کبھی یہ کہ اس کے رسول کتاب وسنت سے ایک بات کا حکم دیتے ہیں (تیسری صورت یہ بھی لکھی ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایک امر کو واجب کر لے جسے نذر کہا جاتا ہے) پہلے کی مثال ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ [الأعراف: 172:7] ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔'' ہے جس کو قرآن کریم نے خود عہد فرمایا ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا عہد یہی ہے جس کو ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔

## میثاق عہد:

﴿مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ مِيْثَاقِهٖ میں ضمیر عہد کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اللہ کی طرف بھی۔ اور اللہ کا عہد کو مضبوط کرنا یا تو یہ ہے کہ

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو اور تم مردہ تھے؟ پھر اس نے تمہیں زندگی دی، پھر تم کو مارے گا، پھر تم کو زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔(43)

---

وہ عہد خود مضبوط ہوتا ہے جیسے عقل وفطرت کی شہادت کہ وہ ایک نہایت مضبوط شہادت ہے اور یا جب رسولوں کے ذریعہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس کو بذریعہ نشانات ودلائل کے مضبوط کیا جاتا ہے اور ﴿مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک شخص اس عہد کو قبول کر کے پھر اسے توڑتا ہے جیسے منافق ہو گیا۔

### قطع مایوصل:

﴿يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ ''ان باتوں کو قطع کرنا جن کے ملانے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔'' یعنی جن حقوق کے ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ان کا ادا نہ کرنا۔ اس میں قطع رحمی بھی آجاتی ہے اور مخلوق کے تمام حقوق بھی آجاتے ہیں۔ گویا حقوق مخلوق کا ادا نہ کرنا بھی فسق ہے۔ خواہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں کے حقوق ہوں، خواہ اپنے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے، خواہ دوسری اقوام کے۔

### فساد فی الارض:

﴿يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ وہ نہ صرف اللہ کے عہد کو توڑتے اور اللہ کی عبادت سے انحراف کرتے ہیں، نہ صرف مخلوق کے حقوق کو ادا نہیں کرتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زمین میں فساد پھیلاتے اور ظلم کرتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ فساد فی الارض ہے اور آخر کار وہ ایک کھلی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی قوم کی آخری حالت کی تصویر ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ہے یعنی وہ سخت نقصان اس دنیا میں بھی اٹھاتے ہیں۔

﴿الْخٰسِرُوْنَ﴾ خُسْرٌ اور خُسْرَانٌ راس المال کے گھاٹے کا نام ہے اور اس کا اکثر استعمال مال وجاہ کے نقصان پر ہوتا ہے۔ مگر قرآن شریف میں عموماً عقل، ایمان اور ثواب کے نقصان پر بولا گیا ہے۔ (غ)

43- اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ پہلی موت سے مراد عدم ہے یعنی نیستی کی حالت سے عالم وجود میں آنا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ [الدھر: 1:76] ''یقیناً انسان پر زمانے کا ایک وقت آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر شے نہ تھا۔'' یہی معنی ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔

### نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے:

پس یہاں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یہ دلیل دی ہے کہ نیستی سے تم کو ہستی کی حالت میں لایا۔ اگر آریوں کی طرح محض یہ مانا جائے کہ

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۹ ع 3 9 3

وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لیے پیدا کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں ٹھیک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔(44)

---

ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہوتا ہے اور نیستی سے ہستی کوئی نہیں تو الوہیت پر دلیل پیدا نہیں ہوتی۔

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ بطور دلیل نہیں بلکہ اس میں آئندہ کی ایک خبر بتائی ہے کہ موت کے بعد وہ تمہیں پھر ایک زندگی عطا فرمائے گا۔

## اللہ کی طرف رجوع:

اور ﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ میں اس دوسری زندگی کی غرض بتائی کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے بالآخر سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوگا۔

44- ﴿ثُمَّ﴾ کے معنی ہیں ترتیب شرط نہیں۔ (مغنی) بعض وقت صرف فا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں یہی معنی ہیں کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمادیا: ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝۳۰﴾[النازعات: 30:79] ''اور زمین کو اس کے بعد بچھایا۔'' یعنی زمین بعد میں بنی۔

﴿اسْتَوٰٓى اِلَى﴾ اِسْتِوٰی جب دو فاعل رکھتا ہو تو مساوی ہونے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے ﴿لَا يَسْتَوٗنَ﴾ اور جب ایک ہی فاعل ہو تو ایک چیز کے اپنی ذات میں اعتدال کی حالت میں ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے: ﴿ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى﴾[النجم: 6:53] ''حکمت والے نے۔ سو وہ اعتدال پر قائم ہوا۔'' اور جب اس کا صلہ الیٰ ہو جیسے یہاں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنا اپنی ذات سے ہو یا تدبیر سے۔ (غ)

﴿السَّمَاۗءِ﴾ لغت میں ہے: [سَمَآءٌ، كُلُّ شَيْءٍ أَعْلَاهُ] ہر ایک چیز کے اوپر جو ہو وہ اس کا سماء ہے۔ یہاں تک کہ وہی چیز اپنے سے اوپر والی چیز کے لحاظ سے ارض ہے اور اپنے سے نیچے والی چیز کے لحاظ سے سَمَآءٌ ہے۔ (غ)

سَبْعٌ یا سات کو اعداد تامہ میں سے سمجھا گیا ہے اور لسان العرب میں ہے کہ عرب لوگ سات اور ستر اور سات سو کے اعداد کو کثرت کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور مثال دی ہے ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾[البقرۃ: 261:2] ''ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے۔'' گویا سات خوشوں سے مراد بہت سے خوشے ہیں ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾[التوبۃ: 80:9] ''اگر تو ان کے لیے ستر دفعہ بھی بخشش مانگے۔'' گویا ستر مرتبہ سے مراد کئی دفعہ ہے۔

﴿فَسَوّٰىھُنَّ﴾ سَوّٰهُنَّ، تَسْوِيَةٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ٹھیک بنانا یا حالت اعتدال پر یا حکمت کے بموجب بنایا۔ (غ) ﴿خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ﴾[الانفطار: 7:82] ''تجھے پیدا کیا، پھر تجھے حکمت سے بنایا۔'' میں یہی معنی مراد ہیں اور یہاں بھی۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي — اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں

﴿عَلِيْمٌ﴾ علم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس کی حقیقت کے ساتھ پالینا۔(غ) اور عَالِمٌ اور عَلِيْمٌ اور عَلَّامٌ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں۔یعنی جاننے والا اس کا جو ہے اور جو اس کے ہونے سے پہلے ہے اور جو ہوگا اور جو اس کے بعد ہوگا اور اس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے۔ان کے ظاہر پر اور ان کے باطن پر اور چھوٹی پر اور بڑی پر۔(ت)

## زمینی مخلوق انسان کے فائدہ کے لیے ہے:

زمین میں جو کچھ ہے اس کو انسان کے فائدے کے لیے بنایا۔اس آخری آیت میں اس اور اگلے دونوں رکوعوں کے مضمون کی طرف اشارہ ہے بنانے والے کی عظمت کی طرف بھی اور اس کے مقام بلند کی طرف بھی جس کے فائدے کے لیے یہ چیزیں بنائیں۔رکوع کو اس بات سے شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور اس پر ختم کیا کہ زمین میں سب کچھ انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا۔اس میں یہ بھی سکھایا کہ تم ان چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے اپنے کام میں لگانا سیکھو۔

## آسمان:

سَمَاء کیا ہے اور سَبْعَ سَمٰوٰتٍ سے کیا مراد ہے؟ لغت میں محض بلندی کا نام سماء ہے۔پس مراد ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو زمین سے اوپر ہم کو نظر آتا ہے وہ کیا چیز ہے؟

## آسمان دخان ہے:

قرآن کریم میں فرمایا:﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ﴾[حٰمٓ السجدة: 11:41] یعنی اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دخان ہے یعنی دھواں ہے۔پس سماء کوئی ٹھوس چیز نہیں۔بلکہ محض ایک دخان ہے۔سائنس کیا کہتا ہے ایتھر ہے، ہاں اس میں ستارے اور سیارے ہیں۔

## سات آسمان:

﴿سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ میں ممکن ہے محض تکثیر مراد ہو یعنی کئی آسمان۔یوں جو اوپر کوئی عالم ہم کو نظر آتا ہے۔ایک تو خود ہمارا نظام شمسی ہے جس میں زمین کے علاوہ سات بڑے سیارے ہیں۔وہ سب چونکہ ہم کو زمین کے اوپر نظر آتے ہیں اس لیے بلحاظ ہماری زمین کے وہ سماء ہیں اور ایک جگہ ان کو ﴿سَبْعَ طَرَآئِقَ﴾ [المؤمنون: 17:23] یعنی سات رستے بھی کہا ہے اور ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰسٓ: 40:36] میں یہ بھی بتادیا کہ سیارے اپنے اپنے فلک میں گردش بھی کرتے ہیں۔پس ایک تفسیر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی ہمارا نظام شمسی بھی ہوسکتا ہے اور دوسری تفسیر کل ستارے جو ہم کو نظر آتے ہیں۔اب تک سائنسدانوں نے ان ستاروں کے جو کھلی آنکھ سے نظر آتے ہیں سات طبقے کیے ہیں اس لحاظ سے کوئی ان میں سے بڑا اور کوئی چھوٹا نظر آتا ہے۔ممکن ہے آئندہ جب افلاک کا علم اور بڑھ جائے تو کوئی اور سات تقسیمیں معلوم ہوجائیں۔قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ صدیوں بعد سچ ثابت ہوا۔مثلاً فرمایا:﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾[الأنبياء: 30:21] یعنی زندگی پانی سے پیدا ہوتی ہے یا فرمایا کہ ہم نے حیوانات، نباتات ہر ایک قسم کے جوڑے پیدا کیے۔ان باتوں کا علم سائنسدانوں کو پہلے نہ تھا۔

الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (45) انہوں نے کہا کیا تو اس

## صفات علم وقدرت:

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کیا اور خاتمہ کمال علم الٰہی پر کیا۔ اس لیے کہ قدرت کاملہ اور علم کامل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں اور انہی دو صفات پر ایمان لانے سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ جب اس کا علم کامل ہے تو انسان دوسروں سے کتنا بھی چھپ کر کچھ کرے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہوگا۔ پھر ہر ایک فعل کی جزا وسزا پر اس کو قدرت بھی ہے۔

45- قول: ﴿قَالَ﴾ مفردات میں ہے کہ قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے یعنی زبان سے الفاظ کا ادا کرنا اور جو دل میں تصور کر لیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کا اظہار ہوا سے بھی قول کہہ دیتے ہیں۔ ﴿وَ یَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ لَوْ لَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ﴾ [المجادلة: 8:58] ''اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔'' اور اعتقاد پر بھی قول کا لفظ بول دیتے ہیں۔ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اسے بھی قول کہہ دیتے ہیں: [اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَ قَالَ قَطْنِیْ] یعنی حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے بس ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ﴾ [حمٓ السجدة: 11:41] ''کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔'' راغب کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر سے تھا نہ ظاہر خطاب سے۔ ﴿قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا﴾ [الأنبيآء: 69:21] ''ہم نے کہا، اے آگ! ٹھنڈک ہو جا۔'' میں یہی توجیہ کی ہے۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ عرب لوگ قول سے تمام افعال مراد لیتے ہیں اور جہاں زبان سے کلام نہ ہو اس پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ [قَالَ بِیَدِہٖ] یعنی پکڑ لیا۔ [قَالَ بِرِجْلِہٖ] چلا گیا۔ [قَالَتْ لَہُ الْعَیْنَانِ] یعنی آنکھوں نے اشارہ کیا۔ [قَالَ بِالْمَآءِ عَلٰی یَدَیْہِ] پانی ہاتھ پر ڈالا۔ [قَالَ بِثَوْبِہٖ] کپڑا اٹھا لیا۔ احادیث میں قَالَ بمعنی آرام کیا، آگے ہوا، مائل ہوا، مارا، غالب آیا ہے۔

**پھر اللہ تعالیٰ کا قول** یا کچھ فرمانا بندوں سے ایک رنگ رکھتا ہے۔ اور فرشتوں سے دوسرا۔ حیوانات سے تیسرا۔ زمین وآسمان سے چوتھا۔ پھر خود انسانوں میں الگ الگ رنگ ہیں۔ ایک بات فطرت میں رکھ دیتا ہے وہ بھی اس کا ارشاد ہے، ایک کی طرف عقل کے ذریعہ ہدایت فرماتا ہے۔ وہ بھی اس کا قول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی وحی اور ہی رنگ رکھتی ہے۔ بذریعہ الہام اور خواب بھی کچھ فرماتا ہے۔ باقی مخلوق کو وہ کس طرح فرماتا ہے اس کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس کے تجربہ سے باہر چیز ہے۔ ایسا ہی ان کا خدا کے حضور کچھ عرض کرنا یہ بھی نہیں سمجھ سکتا ہے۔

﴿الْمَلٰٓئِکَۃِ﴾ مَلَائِکَۃٌ۔ مَلَاكٌ کی جمع ہے جس کی صورت صورت مَلِكٌ ہے اور اس کا مادہ اَلَكٌ ہے اور اَلُوْکَۃٌ بمعنی رسالت ہے گویا مَلِكٌ بمعنی رسول ہے اور یا یہ مَلِكٌ سے مشتق ہے۔

## فرشتوں کا وجود:

ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں اور طاقتوں کا نام ہے۔ حتیٰ کہ نبوت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دے کر اس

يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ　　میں (اسے) بناتا ہے جو اس میں فساد کرتا اورخون

کا نام جبریل قرار دیا ہے۔اس عقیدہ کی رو سے بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وحی الٰہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔

### وحی الٰہی خارجی شے ہے:

حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے تو دوسری صورت ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ [الشوریٰ: 51:42] ''پردہ کے پیچھے سے۔'' فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول بھیج کر اپنا کلام پہنچاتا ہے جہاں رسول سے مراد جبریل ہی ہے۔پس اگر یہ محض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی اور اگر وحی اندر کی آواز نہیں بلکہ خارجی شے ہے تو ملک یا فرشتہ بھی قوائے عالم یا قوائے انسانی کا نام نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ملائک وہ وسائط ہیں جو ان قوائے عالم یا قوائے انسانی کے عمل میں آنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔وہ ان قویٰ پر ایک گونہ حاکم ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ جب انسان کے قوائے ظاہری کے لیے ظاہری وسائط موجود ہیں اور ان کے بغیر وہ قوتیں کام نہیں دیتیں۔مثلاً دیکھنے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ روشنی ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی اور سننے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک سننے کی قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ ہوا ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی۔اسی طرح اس کے قوائے باطنی کے لیے باطنی وسائط کی ضرورت ہے اور یہ وسائط یا نیکی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور ملک کہلاتے ہیں اور یا بدی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور جن یا شیاطین کہلاتے ہیں۔اسی لیے ملک کی پیدائش نور سے اور جن کی پیدائش نار سے مانی گئی ہے۔علاوہ ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں اور اگر غور کیا جائے تو جن لوگوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ نیکی کے کوئی محرک ہیں جن کو ہم ملک کہتے ہیں انہی میں اعلیٰ درجہ کی نیکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور فلسفی جو اس بات پر ایمان نہیں رکھتے وہ عملاً بھی ان نیکی کے محرکات سے فائدہ نہیں اٹھاتے ،جس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے۔کیونکہ اس پر عملی شہادت ملتی ہے۔

﴿خَلِيْفَةً﴾ خَلَفَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔اور خِلَافَةٌ کے معنی دوسرے کی نیابت کرنا ہے یا اس کے قائمقام ہونا بوجہ اس کی غیر حاضری کے یا اس کے مرجانے کے یا کام کی ناقابلیت کے،مگر بعض وقت جس کو خلیفہ بنایا جائے اس کی عزت افزائی کے لیے ہوتا ہے اور اسی آخری وجہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین پر اپنا خلیفہ فرمایا ہے۔(غ)

### ذریت آدم خلیفہ ہے:

یہاں خلیفہ کے معنی میں مفسرین نے عموماً اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد خود حضرت آدم علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت آدم کی ذریت ہے۔ایک اس لیے کہ آگے فساد اور خونریزی کا ذکر ہے اور وہ نسل انسانی کی طرف ہی اشارہ ہے نہ خود آدم علیہ السلام کی طرف۔اور دوسرے اس لیے کہ قرآن کریم میں نسل انسانی کو خلیفہ فرمایا: ﴿وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ [الأنعام:

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ گراتا ہے(46)اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں

165:6] ''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا حاکم بنایا۔'' ﴿وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾[النمل: 62:27] ''اور تمہیں زمین میں حاکم بناتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی نیابت یہ ہے کہ اس کے علم سے اور اس کی قدرت سے کچھ حصہ انسان کو ملا ہے۔

## ضرورتِ نبوت:

اس رکوع میں انسان کے مقام بلند کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ جسمانی رنگ میں وہ اس مقام بلند کو حاصل کر سکتا ہے مگر اخلاقی اور روحانی رنگ میں بغیر اللہ تعالیٰ کی وحی کے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح شرف انسانی کے ساتھ ضرورت نبوت کو وابستہ کر دیا۔

## انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد:

سب سے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کچھ فرماتا ہے۔ ملائکہ چونکہ وسائط ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کا ان کو فرمانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ارادہ الٰہی ظہور میں آئے۔ وہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کوئی اس کی مخلوق میں زمین میں خلیفہ کا حکم رکھے۔ یہ مخلوق انسان ہے جیسا کہ آگے ذکر آتا یا جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے: ﴿اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا﴾[الحجر: 28:15] ''میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔'' اور انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے حصہ ملے گا۔ چنانچہ آگے انہی دو باتوں کا ذکر ہے ایک ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾[31] میں انسان کو علم دینے کا اور دوسرا ملائکہ کو فرمانبرداری کا حکم دے کر اپنی قدرت سے اس کو حصہ دینے کا۔ اور دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾[الجاثیۃ: 13:45] ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمہارے کام پر لگایا۔'' قدرت کی بہت سی طاقتیں ہیں وہ ایک دوسری پر حکمران نہیں ہوسکتیں۔ مگر انسان ان سب پر حکمران ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو ملک سے بھی بڑھ کر شرف حاصل ہے۔

46- ﴿يَسْفِكُ﴾ سَفَكَ سیال چیز کے گرانے پر بولا جاتا ہے۔ (غ) اور عموماً اس کا استعمال خون گرانے پر یا آنسو بہانے پر ہوتا ہے۔ (ر)

﴿الدِّمَآءَ﴾ دَمٌ کی جمع ہے جس کے معنی خون ہیں۔

## فرشتوں کا ذکر فساد:

فرشتوں کا یہ کہنا نہ بطور مشورہ ہے اس لیے کہ مشورہ دینا ان کا کام نہیں۔ ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ اور نہ بطور اعتراض کے ہے۔ اس لیے کہ وہ ﴿يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾[النحل: 50:16] ''اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے کرتے ہیں۔'' کا مصداق ہیں۔ نہ وہ مشورہ دے سکتے ہیں نہ اعتراض کر سکتے ہیں نہ انکار کر سکتے ہیں۔ وہ وسائط ہیں جب ارادۂ الٰہی ایک امر کا ہو تو وہ اس کو عمل میں لے آتے ہیں۔ پھر ان کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ملائکہ کا کہنا فی الحقیقت اس رنگ کا نہیں جس رنگ کا انسان کا کہنا ہے بلکہ یہ محض ایک

قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔(47) فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔(48)

حالت کا اظہار ہے کہ انسان سے فساد اور خونریزی وقوع میں آئے گی اور یہ بالکل سچ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ کیا ایک حاکم کی ضرورت اس لیے ہے کہ زمین میں فساد کرنے والے لوگ ہوں گے۔

**ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا؟:**

دوسرا سوال ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس لیے کہ انسان کے کمالات تو تدریجاً ظہور پذیر ہونے والے تھے لیکن فساد خونریزی پہلے ہی ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ مگر ابھی انسان پیدا ہی نہیں ہوا تو ملائکہ کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ فساد اور خونریزی ہوگی؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پہلے معنی کے لحاظ سے دو جواب ہیں۔ اول اللہ تعالیٰ ہمیشہ خلق کرتا رہا ہے۔ پہلے کوئی ایسی مخلوق گزر چکی تھی۔ دوم خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ متضاد طاقتوں پر حکومت کرے اور یہ نہ ہو سکتا تھا جب تک خود اس کے اندر متضاد طاقتیں جمع نہ ہوں۔ اور متضاد طاقتوں کے ایک ہی مخلوق میں جمع ہونے کا نتیجہ فساد اور خونریزی کو چاہتا ہے۔ بہر حال ملائکہ کی زبان سے انسان کو سمجھایا ہے کہ کس بلند مقصد کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا اور کس طرح وہ فساد اور خونریزی سے اس مقصد کو ترک کر رہا ہے۔

47- ﴿نُسَبِّحُ﴾ تَسْبِیْحٌ۔ سَبَّحَ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی میں اور ہوا میں تیزی سے گزرنا۔ ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰسٓ: 40:36] ''اور سب (اپنے اپنے) دائرے میں چل رہے ہیں۔'' اور عمل میں تیزی سے گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا﴾ [المزمل: 7:73] ''دن کو تیرے لیے لمبا شغل ہے۔'' اور تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں تیزی سے گزرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تنزیہ۔ (غ) یا عیب سے پاک ہونا بیان کرنا۔ سُبْحَانَ اسی سے مصدر ہے اور سُبْحَانَكَ کے معنی ہیں تیری تنزیہ ہوا اور بِحَمْدِكَ ساتھ بڑھایا کہ تیری ذات صرف عیوب سے پاک نہیں بلکہ انعامات کی وجہ سے حمد کی مستحق بھی ہے۔

﴿نُقَدِّسُ لَكَ﴾ قُدَّسَ کے معنی طہارت اور تقدیس کے معنی تطہیر ہیں۔ (ل) نُقَدِّسُ لَكَ کے معنی بعض نے یوں بھی بیان کیے ہیں کہ ہم تیرے لیے اپنے آپ کو اور ان کو جو تیری اطاعت کرتے ہیں پاک رکھتے ہیں۔ (ل) مگر اَلْقُدُّوْسُ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

**تسبیح و تقدیس میں فرق:** تسبیح اور تقدیس دونوں صلہ ل کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی آتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ ہم تیری نسبت طہارت کی طرف کرتے ہیں اور تسبیح اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بلحاظ اس کی ذات کے ہے۔ جسم۔ نِدّ وغیرہ سے پاک ہونا اور تقدیس اس کی تنزیہ بلحاظ صفات یا افعال ہے اور تسبیح و تقدیس کے ذکر سے مراد ہے کہ یہ کہنا بطور اعتراض نہیں کیونکہ تیری ذات اور صفات سب نقائص و عیوب سے مبرا ہیں۔

48- ﴿اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی اس کے اندر کمالات ہیں جن کا علم ملائکہ کو ابھی نہیں دیا گیا اور وہ کمالات ابھی ظاہر ہونے والے تھے۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى اور آدم کو سب کے نام سکھائے۔(49) پھر ان (چیزوں)

49- ﴿اٰدَمَ﴾ ابوالبشر علیہ السلام کے لیے اسم معرفہ ہے۔ مگر بعض وقت مورث اعلیٰ کا نام لیا جاتا ہے مراد اس کی نسل بھی ہوتی ہے۔ یہاں نسل انسانی شامل ہے۔ کیونکہ علم صرف آدم کو نہیں دیا گیا بلکہ نسل انسانی کو بھی۔ امام راغب کہتے ہیں آدم کو آدم اس لیے کہا گیا کہ اس کو عقل وفہم دے کر جسے دوسری جگہ روح سے تعبیر کیا گیا ہے تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی۔ کیونکہ آدم کے معنی میں فضیلت ہے۔ یا آدم نام اس لیے رکھا کہ اس میں مختلف عناصر اور متفرق قویٰ رکھے گئے ہیں جیسے فرماتا ہے ﴿اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ﴾ [الدھر: 2:76] ''ملے ہوئے، اسے ہم آزماتے ہیں۔'' کیونکہ اُدْمَه کے معنی تخلیط یعنی ملانا جلانا آتے ہیں اور حدیث میں جہاں منسوبہ کو دیکھ لینے کی ہدایت فرمائی ہے تو اس کی وجہ بتائی ہے: [يُؤْدِمُ بَيْنَكُمَا] (صحیح ابن حبان، جلد9، صفحہ351، حدیث:4043) جس کی تشریح ابن اثیر نے کی ہے تاکہ تمہارے درمیان محبت اور اتفاق ہو۔

﴿الْاَسْمَآءَ﴾ اسم کی جمع ہے۔ [دیکھو نمبر: 1] بخاری میں اس کی تفسیر میں حدیث شفاعت نقل کی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں آتا ہے: [وَعَلَّمَكَ أَسْمَآءَ كُلِّ شَيْءٍ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قَوْلِ اللهِ ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾: 4476) یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب چیزوں کے اسماء سکھائے۔ پس [أَسْمَآءَ كُلِّ شَيْءٍ] سے مراد سب چیزوں کے اسماء ہیں۔ یعنی سب چیزوں کے نام یا سب چیزوں کی صفات یعنی ان کے خواص۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ الاسماء سے یہاں الفاظ اور معانی مفردات اور مرکبات سب مراد ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا محض نام کسی زبان میں جاننا مفید نہیں ہوتا، جب تک اس نام کے ساتھ اس چیز کی صورت کی طرف ذہن منتقل نہ ہو۔ پس محض نام کا جاننا ایک صوت یعنی آواز ہے اور کسی چیز کے نام کی معرفت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس چیز کی معرفت حاصل ہو اور بعض نے ﴿الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ سے مراد اسمائے ملائکہ لیے ہیں اور بعض نے اسمائے ذریت آدم۔ (ج)

## بنی آدم اور علم اسماء:

اب جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں ہی بنی آدم بھی شامل ہیں یعنی نسل انسانی کا بھی ذکر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝﴾ [الرحمن: 55:3-4] ''انسان کو پیدا کیا، اسے بولنا سکھایا۔'' میں ہر ایک انسان کا ذکر ہے نہ صرف حضرت آدم کا۔ کیونکہ بیان سب کو سکھایا۔ تو پس چیزوں کے اسماء یعنی ان کے صفات یعنی خواص بھی سب کو ہی سکھائے۔ اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ انسان ان باتوں کو خود تدریجاً سیکھتے ہیں۔

## خدا کا انسان کو علم دینا:

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے وہ گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک طرف چیزوں کے اندر خواص رکھ دینا، دوسری طرف انسان کے اندر یہ استعداد رکھ دینا کہ وہ ان کو معلوم کرے یہ انسان کو علم دے دینا ہے۔ گو انسانی جدوجہد کی اس میں ضرورت باقی رہے۔ بعینہٖ جس طرح اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو رزق دے دینا یہ ہے کہ ایک طرف اس رزق کے سامان عالم میں پیدا کر دیئے ہیں اور دوسری طرف انسان کے اندر استعداد رکھ دی ہے کہ

الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

کو فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔(50)

---

ان کو حاصل کرلے اور قرآن کریم نے خود تعلیم یا علم دینے کا استعمال ایسے موقعوں پر کیا ہے۔ جیسے ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾[العلق: 4:96] ”قلم کے ذریعہ سے سکھایا۔“ میں جو علوم قلم کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ تدریجاً ہی انسان کی جدوجہد سے حاصل ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف ہی منسوب کیا ہے۔ اسی طرح کاتب کے متعلق فرمایا کہ وہ لکھ دیا کرے۔ ﴿كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾[البقرۃ: 282:2] جس طرح اللہ نے اسے سکھایا۔ حالانکہ کاتب خود اپنی محنت سے سیکھتا ہے۔ اسی طرح شکاری کتوں کو جو انسان سکھاتا ہے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ﴾[المآئدۃ: 4:5] ”تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا۔“ گویا یہ علم بھی اسی علم میں سے ہے جو خدا نے تم کو تعلیم کیا ہے۔ پس ان تمام موقعوں سے صاف ظاہر ہے کہ نسل انسانی بھی ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ میں شامل ہے۔ کیونکہ ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی ذات اور ان کے خواص کو جاننے کی استعداد رکھ دی ہے۔

## خواصِ اشیاء کا علم:

اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجزاء مختلف اور قوائے متفرق سے پیدا کیا اور اس میں یہ استعداد رکھی کہ وہ قسم قسم کے مدرکات کو معقولات ہوں یا محسوسات یا متخیلات یا موہومات ادراک میں لا سکے اور اشیا کی ذات کی معرفت اور ان کے خواص اور ان کے اسماء اور علم کے اصول اور صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیت اس کے دل میں ڈالی۔

50- ﴿عَرَضَهُمْ﴾ میں ضمیر مسمیات یعنی اشیاء کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اگلے الفاظ ﴿بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ﴾ سے ظاہر ہے اور ضمیر مذکر بوجہ تعظیم ہے یا اس لیے کہ عقلاء کو ان میں غلبہ حاصل ہے۔(ر)

## ملائکہ پر اشیاء کا پیش کرنا:

چیزوں کے پیش کرنے سے مراد قلوب ملائکہ میں ان کی صورت کا آنا یا ان پر ان کا اظہار عالم مثال میں ہے۔(ر)

﴿اَنْۢبِئُوْنِيْ﴾ اَنْبَاءٌ۔ نَبَأٌ سے ہے اس خبر کو کہتے ہیں جس میں عظیم الشان فائدہ ہو۔ جس سے علم یا غلبہ ظن حاصل ہو۔(غ) اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ ان اسماء پر اطلاع پانے میں کوئی فائدہ عظیم حاصل ہوتا ہے۔

## ﴿اَنْۢبِئُوْنِيْ﴾ میں اشارہ:

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مجھے خبر دو اس سے مراد صرف اظہار عجز ملائکہ ہے اور یہ بتانا ہے کہ وہ صفات یا خواص اشیاء کا علم نہیں رکھتے۔ گویا اصل مراد ایک حالت کا اظہار ہے اور قول کا اس کا معنی میں آنا اوپر دکھایا جا چکا ہے۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ صدق ضد کذب ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

انہوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں، مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو علم والا حکمت والا ہے۔ (50أ)

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہا اے آدم ان کے نام انہیں بتادو، پس جب اس نے ان کے نام انہیں بتادیئے، فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے۔ (51)

---

**صادق ہونے سے مراد:**

اور مراد صادق ہونے سے اس خبر کے دینے میں صادق ہونا ہے جس کی طرف اَنْۢبِـُٔوْنِيْ میں اشارہ تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اٹکل پچو ایک بات کے کہنے پر تو جرأت نہیں کرتے۔ پس کیا تم ان اشیاء کے خواص سے واقف ہو یا اِنْ بمعنی اِذْ لے کر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ جب تم حق وصدق کہنے والے ہی ہو تو بتاؤ کہ تم ان اشیاء کے خواص پر آگہی رکھتے ہو۔ اور ایک تفسیر ان الفاظ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اعلم اور افضل مخلوق پیدا نہیں کرے گا۔ تو ان کو اس خیال کی غلطی پر آگاہ کیا اور صدق بمعنی صواب بھی آ سکتا ہے۔ جس طرح کذب بمعنی خطا آ جاتا ہے اور مراد یہ ہوسکتی ہے کہ اگر تم اس خیال میں صواب پر ہو کہ وہ فساد اور خونریزی کرے گا اور مراد اس سے نفی فساد وخونریزی نہیں بلکہ اس کے کمالات کی طرف توجہ دلانا ہے۔

50-أ ﴿الْحَكِيْمُ﴾ حَكَمَ کے معنی ہیں اصلاح کے لیے روکا۔ اور حِکْمَةُ اللہ تعالیٰ میں اشیاء کی معرفت اور ان کا غایت درجہ کی مضبوطی پر وجود میں لانا ہے اور انسان میں حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کا کرنا ہے۔ (غ) اور اسمائے الٰہی میں اَلْحَكِيْمُ سے مراد وہ ہے جس میں حکمت علی وجہ الکمال پائی جاتی ہو۔

**ملائکہ اور علم خواص اشیاء:**

ملائکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں صفات اشیاء کا علم نہیں اور اس سے پہلے سُبْحَانَكَ کو پھر دہرایا ہے یعنی ایسا علم نہ دینے میں اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں اور آخر پر ﴿الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ کہہ کر بتایا کہ کامل علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور وہ اپنی حکمت سے جس قدر اس میں سے چاہتا ہے کسی کو دیتا ہے ملائکہ کو جو وسائط ہیں خواص اشیاء کا علم نہ دینا اس کی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ وسائط کو ایسے علم کی ضرورت نہیں۔

51- **آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا** یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدم نے ان کو وہ علم دے دیا جو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا تھا بلکہ یہ خبر دینا عمل سے ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۗ

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی۔ (52) مگر ابلیس (نے نہ

---

انسان کے اشیاء پر تصرف سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کو ان کی صفات پر اطلاع ہے کیونکہ بغیر صفات پر اطلاع کے تصرف نہیں ہوسکتا۔

﴿مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ كَتَمَ کے معنی چھپانا ہیں مگر ایک چیز جب کسی کے عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس پر بھی كَتَمَ کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔ جیسے بخل کرنے والوں کے بارہ میں ہے ﴿وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾[النسآء: 37:4] ''اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے۔'' جس کی تفسیر امام راغب نے کفران نعمت سے کی ہے ایسا ہی ﴿لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾[النسآء: 42:4] ''اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔'' نہ چھپا رکھنے سے مراد عملاً اس کا اظہار ہو جانا ہے۔ پس ﴿مَا تُبْدُوْنَ﴾ وہ باتیں ہیں جو ملائکہ نے ظاہر کیں یعنی انسان کا فساد اور خونریزی کرنا۔

### ملائکہ کے کتمان سے مراد:

اور ﴿مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ وہ جو ان سے مخفی رہا یعنی انسان کا علم خواص اشیاء اور اس کا کمال اور اسی کا جاننا ان کی غرض تھی جب ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا﴾ کہا تھا کہ انسان کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے۔

### قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض:

اس مضمون پر اتنا زور اس لیے دیا کہ معلوم ہو جائے کہ قوائے عالم پر جو حکمران ہستیاں یعنی ملائک ہیں ان سے بڑھ کر علم اور کمال انسان کو دیا گیا ہے۔ پس انسان کو قوائے عالم کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے بلکہ ان پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

52- **سجدۂ اختیار و تسخیر:** سَجَدَ۔ اُسْجُدُوْا۔ سُجُوْدٌ کے اصل معنی جھک جانا اور فرمانبرداری اختیار کرنا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور اس کی عبادت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور وہ دو طرح پر ہے ایک سجدہ اختیار سے جو انسان کے لیے خاص ہے اور دوسرا تسخیر سے جو انسان، حیوان، نباتات۔ غرض ہر مخلوق اپنے خالق کو کرتی ہے۔ (غ) ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ کے معنی امام راغب نے دو طرح پر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آدم کو بمنزلہ قبلہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا اور دوسرا یہ کہ ان کو اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا اور اس بات کا کہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے مصالح کو قائم کریں۔

### لغوی معنی میں سجدہ:

اصطلاح شریعت میں سجدہ عبادت کے اس خاص رکن کا نام ہے جب پیشانی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور یہ سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے لیے جائز نہیں۔ لیکن یہاں سجدہ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی محض فرمانبرداری کے معنی میں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں [قُلْنَا لَهُ اسْجُدْ لِلَيْلٰى فَاسْجَدَا] جہاں اونٹ کے سر جھکانے پر اُسْجُدْ کا لفظ بولا گیا ہے۔

وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ کی)(52أ) اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔(53)

---

**ملائکہ کے سجدہ سے مراد:**

آدم (انسان) کے کمال کا پہلا مرتبہ تعلیم اسماء ہے یعنی اس میں استعداد علمی کا رکھنا۔ اب یہ اس کے کمال کا دوسرا مرتبہ آتا ہے جس میں ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ملائکہ چونکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں اس لیے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اسی کے مطابق فرمایا: ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثية: 13:45] یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ اس سے بھی مراد ایسی استعداد کا انسان کے اندر رکھنا ہے جس سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے۔ یہی معنی بیضاوی نے لکھے ہیں: [أَوِ التَّذَلُّلُ وَالْاِنْقِيَادُ بِالسَّعْيِ فِيْ تَحْصِيْلِ مَا يَنُوْطُ بِهِ مَعَاشُهُمْ وَيَتِمُّ بِهِ كَمَالُهُمْ] یعنی یا مراد اس سے فرشتوں کا جھک جانا اور فرمانبردار ہونا ہے۔ بذریعہ کوشش کے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن سے ان کی معاش کا تعلق ہے اور جن سے ان کا کمال پورا ہوتا ہے۔ جمع کے صیغہ میں اشارہ ہے کہ آدم میں نسل آدم بھی شامل ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ [الأعراف: 11:7] ''ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری تصویریں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔'' گویا ہر بشر کے لیے وہی ہوتا ہے جو ابوالبشر کے لیے ہوا۔

52-أ) ﴿اِلَّآ﴾ بعض وقت استثنائے منقطع کے طور پر آتا ہے یعنی جس چیز کا استثنا کیا جاتا ہے وہ ان میں شامل نہیں ہوتی جن سے اس کا استثنا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لفظ کا اصل مفہوم صرف مابعد کی ماقبل سے مخالفت ظاہر کرنا ہے۔

﴿اِبْلِيْسَ﴾ بَلَسٌ سے ہے اور اِبْلَاسٌ اس حزن یا غم کو کہتے ہیں جو شدت ناامیدی سے پیدا ہو۔ (غ) ﴿يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [الروم: 12:30] ''مجرم سخت ناامید ہو جائیں گے۔'' پس ابلیس کو ابلیس اس کی شدت ناامیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: [أَلَمْ تَرَ الْجِنَّ وَإِبْلَاسَهَا] (صحيح البخاري، كتاب مناقب الأنصار، باب إِسْلَامِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضى الله عنه: 3866) ابلیس جیسا کہ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے ملائکہ یا اعلیٰ نورانی ہستیوں میں سے نہیں بلکہ وہ جن یا ناری ہستیوں میں سے ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [الكهف: 50:18] ''وہ جنوں میں سے تھا۔'' یہ باتیں کہ ابلیس ملائکہ سے تھا اور وہ سب سے بڑھ کر علم رکھتا تھا اور آدم کی صورت سے یوں کیا کرتا تھا۔ یہودیوں سے سنے سنائے ہوئے قصے ہیں جو تفاسیر میں درج ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر ایک اس قسم کی روایت لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے اسرائیلی قصے درج کر دیئے گئے ہیں جو کلام صحابہ سے نہیں۔

**ابلیس اور شیطان:**

ابلیس کو ہی شیطان بھی کہا گیا ہے۔ جب تک وہ خود انکار کرتا ہے ابلیس ہے۔ جب دوسروں کو ورغلاتا ہے شیطان ہے اور بلحاظ لغت بھی یہی درست ہے۔ کیونکہ ابلیس وہ ہے جو خود رحمت الٰہی سے مایوس ہے اور شیطان جو شَطَنَ بمعنی بَعَدَ یعنی دوری سے

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ اور ہم نے کہا اے آدم! تو اور تیرا جوڑا باغ میں رہو اور

ہے وہ ہے جو دوسروں کو رحمت الٰہی سے دور کرتا ہے۔

## ابلیس اور قوت وہمیہ:

ابلیس سے مراد بعض لوگوں نے قوت وہمیہ کو لیا ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں کا یہی خیال تھا اور اس کی تائید میں انہوں نے شرح فصوص سے بعض حکما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ابلیس اس قوت وہمیہ کلیہ کا نام ہے جو عالم کبیر میں پائی جاتی ہے اور اشخاص انسانی میں جو قوت وہمیہ پائی جاتی ہے یہ اسی کے افراد ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریت کو محض قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے۔ بلکہ درحقیقت جس طرح ملائکہ ایک وجود رکھتے ہیں۔ ابلیس اور اس کی ذریت بھی ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے اور ان کو جن اسی لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے مستور ہیں۔ پس ہر انسان سے تعلق رکھنے والی ایک تو وہ ہستیاں ہیں جن کو ہم ملائکہ کہتے ہیں۔ جو اس کے اعلیٰ قویٰ کو یا نیکی کے میلان کو تحریک میں لاتی ہیں۔

## شیاطین محرک بدی ہیں:

اور دوسرے وہ جن کو ہم جنّ یا شیاطین کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو اس کے قوائے بہیمیہ یا نفس امارہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے بدی کے میلان کو تحریک میں لانے کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان میں ایک قسم کی خواہشات وہ ہیں جو سفلی کہلاتی ہیں کیونکہ اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک وہ جن کا تعلق اس کے اخلاق اور روحانیت سے ہے جو اس کو ایک بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کی ترقی کے لیے دونوں قسم کی خواہشات کا اس میں ہونا ضروری تھا۔ سفلی خواہشات کا اس لیے کہ اس زندگی کے بغیر وہ ترقی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور ملکی خواہشات کا اس لیے کہ ان کے بغیر ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھ سکتا۔

## شیطان کو کیوں پیدا کیا؟

یہ کہنا کہ شیطان کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا؟ گویا اس کا مرادف ہے کہ انسان کو یہ زندگی ہی کیوں عطا فرمائی۔ حیوانی زندگی میں سے ہوکر ہی روحانی زندگی مل سکتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے: [فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ] (صحيح البخاري، كتاب الاعتكاف، باب هَلْ يَدْرَأُ الْمُعْتَكِفُ عَنْ نَفْسِهِ: 2039) شیطان بنی آدم کے ساتھ ایسا ہی لگا ہوا ہے جیسے خون کا بہنا۔ یعنی جیسے اس کی حیوانی زندگی۔

## نوری ناری مخلوق:

اور ملائکہ کو جو نور سے مخلوق اور جنوں کو نار سے مخلوق قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی اسی پر حکمت فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ملائکہ کی تحریک سے انسان کے اندر نور پیدا ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾[البقرة: 2:257] ''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو سخت اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکل کر

اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔'' کیونکہ وہ نار جس کے اندر نور نہ ہو وہ نرا دھواں ہونے کی وجہ سے ظلمت کے قائم مقام ہے۔

53- ﴿اَبٰی﴾ اِبَاء شدت امتناع کو کہتے ہیں یعنی نہایت سختی سے ایک بات سے رکنا۔ یا سختی سے انکار کرنا۔ (غ)

﴿وَاسۡتَکۡبَرَ﴾ کِبۡرٌ سے ہے اور یہ انسان کی وہ حالت ہے کہ وہ اپنے نفس پر فخر کرے اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور سب سے بڑا تکبر قبول حق سے رکنا ہے۔ اِسۡتِکۡبَارٌ دو طرح پر ہے ایک یہ کہ انسان یہ قصد کرے اور چاہے کہ بڑا ہو جائے اور یہ اگر ایسی حالت اور ایسے مکان اور ایسے وقت میں ہو جو واجب ہے تو محمود ہے یعنی اچھی چیز ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے نفس کے لیے وہ کچھ ظاہر کرے جو اس کے لیے نہیں ہے، اور یہ مذموم ہے اور اسی معنی میں قرآن شریف میں یہ لفظ آیا ہے۔ (غ) اور تَکَبُّرٌ کا استعمال بھی دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ کسی کی خوبیاں غیروں پر بہت بڑھی ہوئی ہوں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اَلۡمُتَکَبِّرُ ہے۔ دوسرا یہ کہ تکلف سے اور اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے آپ کو بڑا بنائے اور یہ مذموم ہے۔ (غ)

حکم تو ملائکہ کو تھا کہ سجدہ کریں۔ ابلیس کا ذکر درمیان میں کیونکر آ گیا؟ انسان میں امتیاز کا رکھنا اور ایک حد تک اسے اختیار نیک و بد دینا انسان میں دو قسم کے قویٰ ضروری ٹھہراتا ہے۔ ایک اعلیٰ یا ملکی قویٰ اور دوسرے ادنیٰ یا بہیمی قویٰ۔

## شیطان کو حکم فرمانبرداری:

جس طرح ان اعلیٰ یا ملکوتی قویٰ کو تحریک میں لانے والے ملائکہ ہیں۔ اسی طرح ادنیٰ یا بہیمی قویٰ کے محرک شیاطین ہیں تو جب اعلیٰ ہستیوں کو انسان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا تو ادنیٰ ہستیاں خود اس حکم میں شامل ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ سارے قرآن شریف میں شیطان کو یہ حکم نہیں کہ تو سجدہ کر لیکن ایک جگہ اس کے متعلق لفظ ﴿اِذۡ اَمَرۡتُکَ﴾ [الأعراف: 12:7] ''جب میں نے تجھے حکم دیا'' آ گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ بہ سبب ایک ادنیٰ ہستی ہونے کے وہ بھی اس حکم میں شامل تھا جو اعلیٰ ہستیوں کو دیا گیا۔

## ابلیس کا انکار سجدہ:

جس طرح ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد ان کا انسان کی تکمیل نفس میں معاون ہونا ہے جیسا کہ مفسرین نے بھی مانا ہے۔ اسی طرح ابلیس کا انکار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انسان کی ترقی کی راہ میں حارج ہوگا اور یہ وہ قوت بہیمیہ کو اکسا کر یا نفس امارہ کو تحریک میں لا کر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اس کو اپنا فرمانبردار بنا لیتا ہے یعنی اس کے قوائے بہیمیہ حالت اعتدال پر آ جاتے ہیں اور وہ کبھی ان کو غیر محل پر استعمال نہیں کرتا۔

## شیطان کی فرمانبرداری:

چنانچہ جب نبی ﷺ نے شیطان کا مجری الدم ہونا بیان فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ سے بھی۔ فرمایا ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر مدد دی سو وہ فرمانبردار ہو گیا ہے۔ اور کمال انسانی کا پہلا مرتبہ یہی ہے کہ وہ شیطان کو اپنا فرمانبردار بنا لے اور اس کے قوائے بہیمی اور اس کا نفس امارہ اس کی ترقی کی راہ میں روک نہ ہو۔ اور شیطان کو جو ﴿مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ کہا ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان نعماء کو ان اعلیٰ ملکوتی صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں دبانا چاہتا ہے اور کُفۡرٌ کے معنی دبانا ہیں۔

وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو(54)

54- ﴿اُسْكُنْ﴾ سُكُونٌ کے اصل معنی حرکت کا جاتے رہنا یا ٹھہر جانا اور استقرار ہے۔(ت) اس لیے اضطراب نہ ہونے سے جو حالت اطمینان پیدا ہوتی ہے اس پر بھی لفظ سکون بولا جاتا ہے۔

## خلق آدم میں یہ تیسرا مرتبہ ہے:

پہلے مرتبہ پر اسے علم دیا جاتا ہے۔ دوسرے مرتبہ پر اسے مسجود ملائک بنا کر طاقت دی جاتی ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اسے جنت ملے یعنی راحت و آرام کی زندگی۔ اور یہاں آدم کے ساتھ اس کی بی بی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راحت اور آرام کی زندگی اکیلا انسان حاصل نہیں کر سکتا علم اور طاقت حاصل کر سکتا ہے۔

## بہشت میں بیبیاں:

چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [الروم: 21:30] تمہارے نفسوں سے تمہارے لیے بیبیاں پیدا کر دیں تاکہ تم ان سے راحت پاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ جنت دار الخلد میں بھی بیبیوں کے موجود ہونے کا ذکر ہے۔ اس پر اعتراض کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہاں سکون نہ ہو۔

## آدم کی پہلی جنت:

کیا اس جنت سے مراد وہ بہشت ہے جس کا وعدہ اعمال صالحہ پر ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نہیں۔ کیونکہ وہ جنت جو بعد موت حاصل ہوتی ہے اس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا۔ ﴿وَ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ [الحجر: 48:15] ''اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔'' اور اس سے آدم کو نکلنا پڑا۔ پس یہ جنت اس دنیا کی زندگی کی جنت ہے اور مفسرین نے اسے مانا ہے اور یہاں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تم اسے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ؛ اور سورہ طٰہٰ 118و119 میں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تمہارے لیے اس میں یہ حاصل ہے کہ نہ تم اس میں بھوکے رہو گے نہ ننگے رہو اور نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ میں رہو۔ پس جسمانی لحاظ سے تو انسان کو جنت یوں حاصل ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب سامان پیدا کر رکھے ہیں جن سے انسان کی بھوک دور ہوتی ہے اور پیاس دور ہوتی ہے اور جن سے لباس ملتا ہے اور مکان ملتا ہے۔ اور یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں جو کوشش سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے معنی ظاہر ہیں ایک طرف عالم میں سامان موجود ہیں دوسری طرف انسان میں وہ طاقت ودیعت کی گئی ہے جس سے وہ ان کو اپنے کام میں لاتا ہے یا مسجود ملائکہ بنتا ہے۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں اس کی طاقت بڑھتی ہے اور اسی طرح ہی تدریجاً اس کی راحت کے سامان بڑھتے ہیں۔

## سکون روحانی کی جنت:

مگر ظاہر ہے کہ انسان کے لیے آرام اور راحت یا حالت سکون صرف خورد و نوش اور لباس و رہائش سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایک روحانی سکون کی بھی ضرورت ہے اور وہی اس کی حقیقی جنت ہے۔ کھانے پینے کے سب سامان ہوں مگر سکون قلب

وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (55)

نہ ہو تو اس سے کوئی راحت نہیں پہنچ سکتی۔ اطمینان قلب میسر ہو تو بھوک پیاس اور ہر قسم کی تکلیف انسان خوشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ پس اصل وہ جنت جہاں سکون ملتا ہے گو سامان خورد و نوش کی بھی اس کے لیے ضرورت ہے اور اس کے دینے کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں ایک روحانی جنت یا اطمینان قلب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روحانی سکون یا اطمینان قلب اس وقت تک رہتا ہے جب تک انسان بدی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بدی کے ارتکاب کے ساتھ سکون روحانی دور ہو جاتا ہے۔ پس وہ جنت روحانی یہ ہے کہ انسان معصومیت کے مقام پر ہو۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو فطرتاً بے گناہ پیدا کر کے وہ مقام دے دیا ہے۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ فطرتاً ہم نے تم کو جنت دے دی ہے اب تم خود اس کو ضائع نہ کر دینا۔ ﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ [طٰهٰ: 124:20] جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اس کے لیے تنگی کی روزی ہے جس سے مراد اس سکون روحانی کا جاتے رہنا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قصہ عیسائیت سے لیا گیا ہے جب اس کی بنیاد ہی انسان کے فطری طور پر معصوم ہونے پر ہے۔ حالانکہ عیسائی مذہب نے اسی کو انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔

55- ﴿الشَّجَرَةَ﴾ شَجَرٌ یا شَجَرَةٌ اس نبات کو کہتے ہیں جس کا تنا ہو۔ (غ) یعنی درخت۔ اور شِجَار (ماضی شَجَرَ) اور مُشَاجَرَة اور تَشَاجَرَ کے معنی تنازع اور اختلاف کرنے کے آتے ہیں بعض لوگوں نے شَجَرَةٌ کے معنی جھگڑا کیے ہیں وہ لغت سے ثابت نہیں۔

﴿الظّٰلِمِيْنَ﴾ ظلم کے اصل معنی اہل لغت کے نزدیک [وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَوْضِعِهِ الْمُخْتَصِّ بِهِ] ہیں۔ (غ) یعنی ایک چیز کا اس مقام سے جو اس کے لیے خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا۔ کمی سے ہو یا زیادتی سے یا اس کے وقت سے ہٹ کر یا مکان سے ہٹا کر اس لیے [ظَلَمْتُ الْاَرْضَ] کے معنی ہیں ایسے مقام سے اسے کھودا جو کھودنے کی جگہ نہ تھی اور حق سے مجاوزت کا نام بھی ظلم ہے خواہ وہ نہایت قلیل ہو اور خواہ بہت زیادہ ہو۔ (غ) اور ظلم کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے۔ اول بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اس میں کفر و شرک سب سے بڑھ کر ہے اور دوسرا لوگوں پر ظلم اور تیسرا اپنے نفس سے ظلم۔ اور یہاں یہی اپنے نفس سے ظلم مراد ہے۔ (غ) یعنی اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچانا۔

﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ سے کون سا درخت مراد ہے؟ مفسرین نے گیہوں، کھجور، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ نام گنے ہیں۔ مگر ان کا یہاں کیا مطلب؟ هٰذِهِ میں اشارہ قریب موجود ہے۔ پس اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور ابھی آ چکا ہے اور قریب ترین جو ذکر ہے وہ اَبٰی اور اِسْتَكْبَرَ کا ذکر ہے اور وہ سب سے بڑی بدی ہے جس کی وجہ سے شیطان خود گمراہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی تفسیر دوسری جگہ موجود ہے دیکھو سورہ اعراف آیت 11 سے 19 تک۔ جہاں پہلے شیطان سجدہ سے انکار کرتا ہے تو اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس حالت سے نکل جا۔ تب وہ کہتا ہے میں نسل انسانی کو سیدھی راہ سے پھیر دوں گا اور ان کے آگے پیچھے سے آؤں گا اور وہ شکر گزار نہیں رہیں گے۔ یعنی بدیوں میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد آدم کو حکم ہوتا ہے ﴿اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ اور ﴿وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ [الأعراف: 19:7] ''اور اس درخت کے پاس مت جاؤ'' تو یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ هٰذِهِ میں اشارہ اسی

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

پس شیطان نے ان کو اس سے پھسلا دیا سو ان کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا اتر پڑو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ (56)

---

شیطان کے ورغلانے کی طرف ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں روک بننا چاہتا ہے۔ اور ﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ سے مراد سوائے بدی کے اور کچھ نہیں۔ اور یہی ذکر نسل انسانی کو گمراہ کرنے کا انکار سجدہ کے بعد الحجر۔39 و40 اور بنی اسرائیل۔62 اور ص۔82 و 83 میں موجود ہے۔ اور بدی کو خود قرآن شریف نے ایک درخت سے تشبیہ دی ہے ﴿مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ﴾ [إبراهيم: 14:26] ''ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی طرح ہے۔'' اور ظاہر ہے کہ جس درخت سے آدم کو روکا اسی درخت سے بنی آدم کو بھی روکا ہوگا اور بنی آدم کو فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ﴾ [الأنعام: 6:151] بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ۔

## لاتقربا کا حکم فطری ہے:

اس آیت کا سارا نقشہ حالت اور فطرت کا نقشہ ہے اور ﴿لَا تَقْرَبَا﴾ کا حکم بھی فطرت کے رنگ کا حکم ہے۔ یہ الہام نہیں وحی نہیں کیونکہ الہام اور وحی اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا علاج ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پھر یہ میاں بی بی دونوں کو حکم ہے جہاں وحی کا ذکر آتا ہے وہاں ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ﴾ ہے یعنی آدم کو وہ کلمات سکھائے گئے۔ پس یہ فطری حکم ہے اور اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ فطری حکم بھی اللہ تعالیٰ کے عہد میں داخل ہے [دیکھو نمبر: 42]۔ مگر انسان کمزور ہے اس لیے اس فطری حکم کی تقویت کے لیے وہ ذکر کا محتاج ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اسے عطا فرماتا ہے۔

## بائبل کی غلطی کی اصلاح:

بائبل نے ﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کو نیکی اور بدی کی تمیز کا شجر کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام کو اس سے روکنے کے یہ معنی ہوئے کہ اس کو تمیز کا جوہر خدا نے عطا نہ کیا تھا۔ پھر حیوانوں پر اس کی فضیلت کیا؟ اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ وہ عجیب جوہر جس سے انسان حیوان پر ممتاز ہوتا ہے خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے انسان نے زبردستی حاصل کر لیا۔ قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہو گے یعنی اس اطمینان قلب اور راحت روحانی کو کھو دو گے جو فطرت نے تمہیں دی ہے۔ کس طرح اس کو کھو دیا اس کا نقشہ سورۂ اعراف میں کھینچا ہے۔

56- ﴿فَاَزَلَّهُمَا﴾ اَزَلَّ زِلّ سے ہے اور زِلَّةٌ کے معنی [اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ] ہیں۔ (غ) یعنی بلا ارادہ پاؤں کا ڈگمگا جانا۔ اور اس لیے زِلَّةٌ اس قصور کو کہا جاتا ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو۔ (غ) پس ﴿فَاَزَلَّهُمَا﴾ کے معنی ہوئے ان سے زِلَّةٌ کا

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ
پھر آدم نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھ لیں۔ پس اس نے اس پر (رحمت سے) توجہ کی، بے شکوہ

---

ارتکاب کرایا۔ یعنی شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے مگر بغیر عمد اور ارادہ کے آدم اور اس کی زوجہ سے کوئی قصور ہو گیا۔

﴿عَنْهَا﴾ میں ضمیر شَجَرَۃٌ کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی اس درخت کی وجہ سے ان سے لغزش کرادی اور جنت کی طرف بھی۔ یعنی ایسی لغزش کرادی کہ جنت سے نکلوا دیا۔

﴿اهْبِطُوْا﴾ هَبَطَ کے وہی معنی ہیں جو نَزَلَ کے ہیں۔ (ف) اوپر سے گرنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے ﴿يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: 74:2] ''،'' اور کسی مقام پر اترنے کے معنی میں بھی ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ [البقرة: 61:2] ''،'' امام راغب هَبَطَ اور نَزَلَ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ هُبُوْطٌ استخفاف کے رنگ میں ہوتا ہے اور نزول اکرام کے رنگ میں۔ اور حدیث میں آتا ہے: [اَللّٰهُمَّ غِبْطًا لَاهَبْطًا] (کتاب الکلیات: جلد 2، صفحہ 672) جس کے معنی ابن اثیر یوں کرتے ہیں کہ ہم تجھ سے اچھی حالت کی التجا کرتے ہیں اور ذلت اور انحطاط سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ نقل مکانی کے علاوہ اس کے معنی ایک حالت سے دوسری کی طرف نکل جانا بھی ہیں اور هَبَطَ کے معنی نقصان بھی ہیں۔ چنانچہ هَبَطَ الْقَوْمُ کے معنی لکھے ہیں پستی کی حالت میں ہو گئے اور نقصان اٹھایا۔ (ت) روح المعانی میں بھی ہے کہ هَبَطَ مرتبہ سے گر جانے پر بولا جاتا ہے۔

## شیطان کی وسوسہ اندازی:

یہاں پر مفسرین نے بہت سے قصے اسرائیلیات سے داخل کر دیئے ہیں۔ کہیں شیطان کو سانپ بنا کر اور کہیں چار پایہ بنا کر جنت میں داخل کیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود فرما دیا ہے کہ یہ بذریعہ وسوسہ اندازی کے تھا۔ ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ [الأعراف: 20:7] ''پھر شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ ڈالا'' اور ہر ایک انسان کے دل میں شیطان وسوسہ اندازی سے ہی کام کرتا ہے ﴿يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ [الناس: 5:114] ''لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔'' چونکہ آدم جس جنت میں تھے وہ اطمینان قلب کی جنت ہے اور وہ دار الخلد نہیں جو انسان کو موت کے بعد بطور جزائے اعمال عطا کی جاتی ہے جہاں شیطان کا گزر نہیں۔ اس لیے شیطان کے وسوسہ ڈالنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ فطری بے گناہی گو ایک اطمینان قلب کی حالت ہے مگر وہ کامل اطمینان کی حالت نہیں جہاں شیطان وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اسی دوسری حالت پر انسان کو صرف وحی الٰہی پہنچاتی ہے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

## آدم کی لغزش:

یہاں لفظ آزَلَّ یا آزَلَّہٗ اختیار کر کے بتا دیا کہ آدم سے جو کچھ ہوا بلا قصد ہوا۔ اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰهٰ: 115:20] ''مگر وہ بھول گیا، اور ہم نے اس کا عزم نہ پایا۔'' مطلب یہ ہے کہ گو فطری بے گناہی حاصل ہے مگر فطری کمزوری بھی ساتھ ہی لگی ہوئی ہے جب تک اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق خاص حاصل نہ ہو جو وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اس وقت تک انسان کو ٹھوکریں لگتی رہتی ہیں۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ (رحمت سے) توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(57)

---

﴿مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ سے مراد وہ حالت جنت یا حالت اطمینان قلبی ہے جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا۔ کیونکہ جب گناہ آیا تو اطمینان قلب گیا۔

### ھبوط آدم سے مراد:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ یہ کہنا بلحاظ اس حالت کے ہے جو پیدا ہوگئی۔ گویا پہلے فعل کا نتیجہ یہ ہوا کہ نتیجہ بھی چونکہ حکم الٰہی سے وارد ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر قُلْنَا کا لفظ فرمایا دیکھو قول کے معنی میں نمبر 45۔ ﴿اهْبِطُوْا﴾ میں ضمیر جمع ہے اس لیے خطاب آدم اور اس کی ذریت سب سے ہے یعنی سب انسانوں سے جیسا کہ فراء نے کہا ہے۔(ر) اور آدم اور حوا اور ہر ایک انسان کو یہ وحی تو ہوئی نہیں اس لیے قُلْنَا اظہار حالت کے لیے ہی ہے۔ چونکہ یہ حالت نقصان کی تھی اس لیے هَبَطَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ اس میں شیطان کی عداوت کا ذکر نہیں۔ کیونکہ اس کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے پہلے جتلا دیا تھا ﴿اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ﴾ [طٰهٰ: 117:20] ''یہ تیرا اور تیرے جوڑے کا دشمن ہے۔'' پس یا تو انسانوں کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم فطرت کی حالت کو چھوڑتے ہو تو پھر ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جاتے ہو اور ﴿يَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ کے مصداق بن جاتے ہو۔

### نفس انسانی اور شیطان:

اور یا یہ مراد ہے کہ ہر انسان کے اندر دونوں قسم کی تحریکات ہیں وہ جو اس کو بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں اور وہ جو اس کی پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یوں گویا انسان کا اپنا ہی ایک حصہ دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس معنی سے وجود شیطان کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس طرح انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے ﴿وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ [قٓ: 16:50] ''اور ہم جانتے ہیں جو اس کا نفس وسوسہ ڈالتا ہے۔'' اور شیطان بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے ﴿الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝﴾ [الناس: 114: 4-6] ''پیچھے ہٹ جانے والے۔ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے۔'' اور نفس بھی بدی کا حکم دیتا ہے ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ [یوسف: 12: 53] ''کیونکہ نفس تو یقیناً بدی کا حکم دیتا رہتا ہے۔'' اور شیطان بھی بدی کا حکم دیتا ہے ﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ [النسآء: 119:4] ''اور انہیں کہوں گا، سو وہ اللہ کے بنائے ہوئے (دین) کو بدل دیں گے۔'' اسی طرح شیطان بھی دشمن انسان ہے جیسا کہ بار بار قرآن میں فرمایا اور انسان کا نفس بھی جس پر حدیث بھی شاہد ہے: [أَعْدٰى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ؟ اَلَّتِيْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ] (کنز العمال: 11263) سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ شیطان کا تعلق نفس امارہ سے ہے اور اسی کا وہ محرک ہے۔

57- ﴿فَتَلَقّٰٓى﴾ تَلَقّٰى لَقِيَ سے ہے اور لِقَاءٌ کے معنی کسی چیز کا سامنے آجانا اور اسے پالینا ہیں۔(غ) اور [تَلَقَّى الشَّيْءَ] کے معنی

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ

ہم نے کہا سب اس سے اتر جاؤ،(58) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلا نہ

لَقِيَهُ یعنی اس کو ملا۔ گویا کلمات کو لے لینے اور قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے ان کا استقبال کیا۔

﴿ كَلِمٰتٍ ﴾ كَلِمَةٌ کی جمع ہے اور کلمہ وہ تاثیر ہے جو دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ پائی جائے یعنی شنوائی کے حاسہ سے کلام یا بات اور بینائی کے حاسہ میں كَلْمٌ یا زخم۔ (غ) اور كَلِمَةٌ سے مراد صرف لفظ مفرد نہیں بلکہ کلام بھی ہوتا ہے ﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً ﴾ ''بڑی بات ہے۔'' [الکھف: 5:18]

﴿ فَتَابَ ﴾ تَابَ تَوْبٌ سے ہے جس کے معنی رجوع ہیں اور جب بندہ کے لیے استعمال ہو تو مراد اللہ کی طرف لوٹ آنا اور جھک جانا اور رجوع کرنا ہوتا ہے۔ (ت) یہ ضروری نہیں کہ پہلی حالت بری ہو بلکہ ایک اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے۔ ایک خدا پرست بھی جب خدا کی طرف اور زیادہ فرمانبرداری سے جھکتا ہے تو وہ اس کی توبہ ہے؛ اور جب اللہ کے لیے ہو تو مراد اس سے بندہ کی طرف مغفرت کے ساتھ عود کرنا ہوتا ہے۔ (ت) اسی سے تَوَّابٌ مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

### فطری کمزوری کا علاج:

جب آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے تو اللہ نے اس پر رجوع برحمت فرمایا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو نقص اس میں تھا وہ دور کر دیا گویا فطری کمزوری کے نقص کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا۔ پس بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان خدا کے کلام میں ہے۔

### وحی الٰہی خارجی شے ہے:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلام الٰہی انسان کے اندر کی آواز نہیں جیسا کہ سرسید نے غلطی سے خیال کر لیا۔ کیونکہ اگر یہ بات پہلے فطرت میں ہی موجود تھی تو فطرت کی کمزوری کا علاج خود فطرت کی آواز کس طرح کر سکتی ہے؟ علاج صرف خارجی ہو سکتا ہے اور خدا کے کلام سے یہ علاج ہوا۔ اس آیت میں ذکر صرف ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ہے کیونکہ کلمات صرف اس نے سیکھے۔ دوسرے انسان سیکھ سکتے ہیں یا نہیں اور کس طرح؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

58- **اولاد آدم کا ہبوط اور اس کا علاج:** ﴿ اهْبِطُوْا ﴾ کا حکم تو پہلے بھی ہو چکا تھا دوبارہ کیوں فرمایا؟ پہلے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کا ذکر مشترک تھا۔ اس کے بعد ﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾ میں آدم علیہ السلام کے ذکر کو الگ کر دیا۔ آدم ابوالبشر کو وحی عطا فرمائی۔ مگر اس کے بعد ہر ایک انسان کو وحی نہ دی جاتی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق یہاں قانون بیان فرمایا کہ اس حالت ہبوط کا علاج یہ ہے کہ نسل انسانی میں وقتاً فوقتاً منجانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ اس کی پیروی سے پھر انسان اس کھوئی ہوئی جنت کو، اس اعلیٰ مقام روحانیت کو، اس راحت و سکون کو حاصل کر سکتا ہے جس سے پھر وہ نکلے گا نہیں۔ پہلے آدم میں ابن آدم بھی شامل تھا۔

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (59)

---

یہاں آ کر آدم نبی اللہ کو ابن آدم سے الگ کر کے دکھا دیا۔

59- ﴿فَاِمَّا﴾ اِمَّا مرکب ہے اِنْ حرف شرط سے اور مَا سے جو تاکید کے لیے ہے اور اس کے بعد اکثر فعل تاکید آتا ہے۔

﴿هُدًى﴾ کے معنی پر [دیکھو نمبر: 5] یہاں وہ ہدایت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دنیا میں بھیجتا ہے۔

﴿تَبِعَ﴾ کے معنی نقش قدم پر چلنا ہیں اور یہ کبھی حکم پر عمل کرنے سے ہوتا ہے جیسے یہاں۔(غ)

﴿خَوْفٌ﴾ کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع جس کے مقابل پر رجاء ہے جو کسی محبوب امر کی توقع ہوتی ہے۔خوف امن کی ضد ہے۔ (غ)

﴿يَحْزَنُوْنَ﴾ حُزْنٌ اور حَزَنٌ اصل میں زمین میں خشونت یعنی سختی کا ہونا ہے۔ پھر غم سے جو نفس میں خشونت پیدا ہوتی ہے اس پر بولا گیا ہے۔(غ)

## نسل انسانی میں نزول وحی کا قانون:

جب آدم علیہ السلام پر وحی کے نزول کا ذکر فرمایا تو اب نسل آدم کے لیے بھی قانون بتایا کہ ہر ایک پر وحی نہیں آئے گی بلکہ انسانوں میں کبھی بھی کوئی ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجایا کرے گی۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ [الأعراف: 35:7] تمہارے پاس کبھی رسول آجایا کریں گے۔ یہ نسل انسانی کے ہادی ہوں گے۔ اس طرح پر کہ جو شخص اس ہدایت کی جو وہ لائیں پیروی کرے گا (لفظ تَبِعَ یہاں قابل توجہ ہے خالی ایمان نہیں بلکہ اس ہدایت کی پیروی کی ضرورت ہے) وہ اس اصل حالت پر قائم ہو جائے گا جہاں نہ شیطان کے حملے کا خوف ہے کہ وہ وسوسہ اندازی سے پھسلا دے اور نہ یہ غم ہو گا کہ یہ راہ اختیار کی یا نہ کی کیونکہ انہوں نے صحیح راہ پر قدم مارا۔

## فطری بے گناہی اور کامل عصمت:

اس میں آخری کامیابی کی طرف اشارہ ہے گویا پہلی فطری حالت اس مقام امن تک نہ پہنچا سکتی تھی جہاں شیطان حملہ ہی نہ کر سکے مگر وحی الٰہی کی اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق پیدا کرتا ہے کہ پھر وہ کبھی پھسلتا نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ [الحجر: 42:15] ''کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔'' فطری حالت بھی ایک بے گناہی کی حالت ہے۔ مگر چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق پیدا نہیں ہوا جس کی طاقت اس کمزوری کا علاج ہو جائے۔ اس لیے وہ ابھی خوف کی حالت ہے کہ شیطان حملہ آور ہو کر اس جنت سے نہ نکال دے۔

## وحی کی ضرورت:

لیکن جس حالت امن و اطمینان پر وحی الٰہی کا اتباع پہنچاتا ہے وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہے اور یوں بتایا کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا میں کیا ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ سے ہو سکتا ہے اور وہی انسان گرنے

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۠ ۳۹ ع 4/10/4

اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (60)

---

سے بچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے آپ کو دے دیتا ہے۔ ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ نجات کامل ہے جس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا: ﴿یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۲۷ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۲۸ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۲۹ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۳۰﴾ [الفجر: 89:27-30] ''اے اطمینان پانے والی جان! اپنے ربّ کی طرف لوٹ آ؛ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

60- ﴿كَذَّبُوْا﴾ كِذْبٌ سے ہے كَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی طرف جھوٹ منسوب کیا یعنی یہ کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ (غ)

﴿بِاٰیٰتِنَاۤ﴾ اٰیٰت اٰیَةٌ کی جمع ہے اور یہ تأیّي سے ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا اور اٰیَةٌ کے معنی ظاہر نشان ہیں اس لیے بلند عمارت کو بھی اٰیَةٌ کہتے ہیں۔ ﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً﴾ [الشعرآء: 26:128] ''کیا تم ہر اونچی جگہ پر یادگاریں بناتے ہو۔'' اور اٰیَةٌ رسالت یعنی پیغام الٰہی کو بھی کہتے ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (ت) اور یہی معنی اٰیَةٌ کے عموماً زیادہ تر موزون ہیں اس لیے آیات سے یہاں بعض مفسرین نے کتب منزلہ مراد لی ہیں۔ (ر) اور قرآن کریم کے ہر ایک جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سورت ہو یا اس کی کئی فصلیں یا ایک فصل ہو۔ (غ) اور بعض کے نزدیک آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنی جماعت ہیں اور ہر آیت میں الفاظ وحروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنی نشان ہیں اور کلام الٰہی کی آیات بطور اعجاز کے نشان ہیں۔

﴿اَصْحٰبُ﴾ صَاحِبٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ملازم یعنی کسی شے کے ساتھ لگ جانے والا۔ خواہ مصاحبت جسم سے ہو خواہ عنایت وہمت سے۔ (غ)

﴿اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ وہ لوگ ہوئے جنہوں نے نار سے تعلق پیدا کر رکھا ہے۔ گویا آگ کے ساتھ ان کا ہر وقت تعلق ہے۔ یہی تعلق آخرت میں کھلا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

### اس دنیا کا دوزخ:

اصل غرض تو انسان کو اس کے کمال کی راہ بتانا تھا مگر جب وہ بتا دی تو جو لوگ ان کے مقابل پر ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ جب الٰہی پیغام آتا ہے تو نہ صرف اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو جھوٹا بھی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اقوال وافعال میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اس امن واطمینان کی بجائے جو اتباع آیات کرنے والوں کو حاصل ہے ﴿لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ﴾ ان کا تعلق نار کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ گویا ایک جلن اور قلق اور اضطراب ان کے اندر رہتا ہے یہ تو اس دنیا کی حالت ہے اور آخرت میں وہی جنت ونار ایک ظاہری صورت اختیار کر لیں گے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ

اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی(61) اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو

---

61- ﴿بَنِيْ﴾ بَنُوْ۔ اَبْنَاء۔ اِبْنٌ کی جمع ہے اور یہ لفظ بِنَاءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی بنائی ہوئی چیز ہیں یا مصدر بنانا کے معنی میں۔ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے: ﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا﴾ [الذاریات: 47:51] ''اور آسمان کو ہم نے بنایا۔'' ﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً﴾ [التوبۃ: 110:9] ''ان کی عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، بے چینی کا موجب رہے گی۔'' ﴿قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا﴾ [الصافات: 97:37] ''انہوں نے کہا اس کے لیے ایک عمارت بناؤ۔'' ﴿كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ [الصف: 4:61] ''گویا کہ وہ مضبوط دیوار ہیں۔'' اور بیٹے کو ابن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود باپ سے ہوا۔ پھر ہر چیز کو کسی شے کی جہت سے یا اس کی تربیت سے یا اس کے تعاہد سے یا کثرت خدمت سے یا اس کے قیام امر سے حاصل ہو اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ ابن حرب، ابن العلم وغیرہ ابن السبیل مسافر ہے۔ (غ)

﴿اِسْرَآءِيْلَ﴾ عبرانی ہے اَسَرَ بمعنی عَبَدَ ہے عربی میں اَسَر کے معنی قید کرنا ہیں جس سے اَسِيْرٌ اور جمع اُسَارٰی اور اَسْرٰی ہے اور ''اِيْل'' اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اسی نام سے اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح علیہ السلام نے صلیب پر پکارا۔ پس اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ یا اللہ کا بندہ ہوئے اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔

### بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل:

توحید الٰہی اور ضرورت نبوت کا ذکر کر کے اب ایک قوم کا ذکر نمونہ کے طور پر کیا ہے۔ بنی اسرائیل سے مراد وہ قوم ہے جو حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسماعیل ہیں۔ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد۔ پس بنی اسرائیل قوم جس کو یہاں خطاب کیا ہے اور بنی اسماعیل جس میں سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ دو بھائی بھائی قومیں ہیں۔ بنی اسماعیل پہلے سے ملک عرب میں آباد ہوئے اور بنی اسرائیل کوئی ڈیڑھ سو سال کنعان میں رہ کر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں چلے گئے۔ کوئی چار سو برس وہاں رہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ارض مقدس میں واپس آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع کے ماتحت ارض مقدس کو فتح کیا۔

### عرب میں یہودی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے کئی سو سال پیشتر بہت سے یہودی عرب میں آ کر آباد ہوئے۔ اغلب یہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی پیشگوئیوں کی بنا پر انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان میں سے تین قومیں خاص مدینہ میں آباد تھیں۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع۔ خیبر میں بھی یہودی آباد تھے اور ان کی وہاں حکومت تھی۔

### بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود:

قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا سب مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ہے، قصہ کے طور پر نہیں۔ بنی اسرائیل کا ذکر

بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔(62)

سب سے پہلے کیا ایک اس لیے کہ اس کا خاص تعلق بنی اسماعیل سے ہے۔ پھر اس لیے کہ یہ قوم تمام نعمتوں کی وارث بھی ہوئی۔ انبیاء علیہم السلام ان کو کمال روحانی پر پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے۔ ظاہری کمال ان کو فتوحات کی صورت میں عطا فرمایا۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس نعمت کا ذکر کیا ہے: ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ [المآئدة: 20:5] یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی نعمتوں سے متمتع فرمایا۔ پھر تمام نعمتوں کے بعد اپنی بدعملیوں سے غضب کے نیچے بھی آئے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں سے بھی ہوا۔ گویا انہی کی تاریخ بنی اسرائیل کے قصہ میں بطور ایک پیشگوئی کے لکھی گئی ہے اور یہ تفسیر زبان نبوی سے ہی سمجھنی چاہیے۔ اس لیے کہ متفق علیہ حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: [لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ] (صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ: 3456) ''تم بھی پہلوں کے طریق پر قدم بقدم چلو گے'' اور جب دریافت کیا گیا [الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ!؟] ''یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ؟'' تو فرمایا: ''ہاں اور کون؟'' تو گویا اس آیت میں مسلمانوں کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو ان کو دی گئی تھیں اور جن دونوں سے وہ آج محروم ہیں۔ ہاں اول اپنے آپ کو اپنے عمل سے نعمت روحانی سے محروم کیا تو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ان پر مسلط کر کے نعمت جسمانی سے ان کو محروم کر دیا۔ اے کاش ہم قرآن سے کچھ سبق لیتے۔

62- ﴿فَارْهَبُوْنِ﴾ رَهَبٌ کے معنی ایسا خوف ہے جس میں احتیاط ملی ہوئی ہو اور اضطراب۔ (غ) ﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ [الحشر: 13:59] ''اللہ کی نسبت تمہارا ڈر زیادہ ہے۔'' ﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ﴾ [الأنفال: 60:8] ''تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔'' وغیرہ۔ اسی سے تَرَهَّبَ بمعنی عبادت ہے اور رُهْبَانِيَّةٌ عبادت میں غلو کا نام ہے۔ فَارْهَبُوْنِ اصل میں فَارْهَبُوْنِيْ ہے یعنی مجھ سے ہی خوف کرو۔ اِيَّايَ حصر کے لیے بڑھا دیا یعنی اور کسی کا ایسا خوف نہ ہو۔

## بنی اسرائیل کا خدا سے عہد:

دونوں عہدوں کا ذکر کتاب [استثنآء: 17:26, 18, 19] میں ہے:

''تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا جیسا کہ اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کی خاص گروہ ہووے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور عزت اور نام میں بالا کرے۔''

خداوند کی آواز کا شنوا ہونے کا یہ مطلب تھا کہ نبی آخر الزمان کو تسلیم کریں۔

## مسلمانوں کا عہد:

ایسا عہد مسلمانوں سے بھی لیا گیا تھا ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة: 111:9]

وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَ لَا تَشْتَرُوْا

اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا، اسے سچا ٹھہراتا ہوا جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ ہو۔ (63)

"اللہ نے مومنوں سے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اور اس کا معاوضہ جنت ہے۔" اب مسلمان اس عہد پر قائم نہیں رہے اور یہی ان کی مصیبتوں کی اصل وجہ ہے۔

63- ﴿مُصَدِّقًا﴾ صِدْقٌ سے ہے اور [صَدَّقْتُ فُلَانًا] کے معنی ہیں میں نے اسے صدق کی طرف منسوب کیا۔ (غ)

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ تصدیق کے معنی ہیں کسی کو سچا قرار دینا اور مصدق کے بعد صلہ "ل" لانے سے یہ غرض ہے کہ یہ تصدیق اس کے فائدہ کے لیے ہے جس کی تصدیق کی گئی ہے۔

## قرآن کا سب کتابوں کا مصدق ہونا اور اس سے مراد:

قرآن کریم کو صرف بنی اسرائیل کی کتب کا مصدق ہی نہیں کہا گیا بلکہ دوسری جگہ کل کتب منزلہ کا مصدق بھی کہا گیا ہے ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ [المآئدۃ: 48:5] "اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے۔" قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس نے نہ صرف انبیائے بنی اسرائیل کو سچا قرار دیا بلکہ تمام دنیا کے انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ کے ایک اور معنی بھی ابن جریر میں مروی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئیاں ان کے پاس تھیں۔ پس آپ کے ظہور سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوئی ورنہ ان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا۔

## مثیل موسیٰ کی پیشگوئی:

مثال کے طور پر خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کو لو: "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔" [استثنآء: 18:18] اب موسیٰ جیسا ایک نبی آنا اس پیشگوئی کی رو سے ضروری ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی نبی نے موسیٰ کی مثل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی بنی اسرائیل کا کوئی نبی موسیٰ علیہ السلام جیسا ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سب ایک رنگ میں حضرت موسیٰ کے خلفاء تھے۔

## حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار:

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک برابر یہودیوں کو اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا، کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا کہ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ یہاں وہ نبی پر تمام بائبلوں میں [استثنآء: 18:18] کا حوالہ موجود ہے یعنی مثیل موسیٰ نبی [یوحنا: 21:1] اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک یہود کو تین نبیوں کی انتظار تھی۔ ان میں سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو الیاس کی آمد کا مصداق خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قرار دیا اور مسیح ہونے کا خود دعویٰ کیا۔ مگر وہ مثیل موسیٰ نبی ابھی باقی رہ گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی ہوا نہیں۔

بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَ اِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور میری باتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔(64)

وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ اور (نہ) سچ کو چھپاؤ اور تم جانتے ہو۔(65)

---

**یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت:**

پس اگر آنحضرت ﷺ ظاہر ہوکر مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تو اس پیشگوئی کو ہی غلط ماننا پڑتا۔ پس آنحضرت ﷺ کے ظہور سے اس پیشگوئی کی سچائی ظاہر ہوئی اور دوسری طرف یہ عجیب بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بہت ہی ابتدائی وحی میں یہ لفظ آتے ہیں کہ یہی وہ موسیٰ جیسا نبی ہے جیسا کہ سورہ مزمل سے ظاہر ہے کہ ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا﴾[المزمل: 15:73] ''جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا۔'' اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں پر آنحضرت ﷺ کی صداقت کی ایسی اتمام حجت ہے جس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں۔ ایسا ہی اور کئی پیشگوئیاں ہیں جن کا مصداق ان میں کوئی نبی نہیں ہوا اور نبی ﷺ کے ظہور سے ہی ان پیشگوئیوں کی سچائی ثابت ہوئی۔ یہی بالخصوص یہاں مراد ہے یعنی تم کو اس نبی کے ماننے میں کیا عذر ہے جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے جو تمہاری اپنی کتابوں میں ہیں۔

64- ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تھوڑے مول سے مراد دنیوی زندگی کے فوائد ہیں۔ ان کی خاطر ہی اکثر انسان حق کو قبول کرنے سے رک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾[النسآء: 77:4] دنیا کا سارا سامان ہی ایک قلیل شے ہے۔

65- ﴿تَلْبِسُوا﴾ لَبَسَ کپڑا پہننا ہے یا کپڑے سے اپنے آپ کو چھپا لینا۔ اسی سے لباس ہے [دیکھو نمبر: 233] پھر ظاہر سے باطن کی طرف معنی چلے گئے ہیں اور [لَبَّسْتُ عَلَيْهِ أَمْرَهُ] کے معنی ہیں میں نے اس کا امر اس پر مخفی کر دیا۔ (غ)

﴿الْحَقَّ﴾ راغب کہتے ہیں کہ حق کے اصل معنی مطابقت اور موافقت ہیں اور کئی وجہ پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اَلْحَقُّ کہا گیا ہے اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کا اس کے مطابق جو اقتضائے حکمت ہے وجود میں لانے والا ہے ﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾[الأنعام: 62:6] ''پھر وہ اپنے مولا برحق کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔'' اور خدا کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو اس لحاظ سے حق کہا جاتا ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق وجود میں آئی ہیں اور ہر فعل و قول کو حق کہا جاتا ہے جو اس کے مطابق جو واجب ہے اور اس اندازہ سے جو واجب ہے اور اس وقت پر جو واجب ہے ہو۔ (غ) اور حق کے بہت سے معنی میں سے صدق بھی ایک معنی ہیں۔ (ت) اور حق نقیض باطل ہے۔

﴿بِالْبَاطِلِ﴾ بَاطِلٌ نقیض حق ہے وہ چیز جس کے لیے جب تحقیق کی جائے تو کوئی ثبات نہ ہو۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھکے رہو۔ (66)

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (67)

---

## حق و باطل کی ملاوٹ:

یہاں حق سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اب تک ان کی کتابوں میں چلی آتی تھیں۔ اور باطل ان کی اپنی خواہشات جن کے ساتھ پیشگوئیوں کو خلط کرتے تھے۔ پیشگوئیوں کو چھپانے کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے: ﴿قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة: 76:2] اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں تم ان سے وہ باتیں کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں۔

66- ﴿الزَّكٰوةَ﴾ زَکَا سے مشتق ہے اور کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے اور یہ وہ مال ہے جو فقرا کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ اس لیے کہا گیا کہ حقیقۃً اس سے برکت ہوتی ہے یعنی مال بڑھتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ (غ)

﴿ارْكَعُوْا﴾ رُکُوعٌ کے اصل معنی جھک جانا ہیں اور ایسی فرمانبرداری پر بولا جاتا ہے جب انسان دوسرے کے آگے جھک جائے۔ اور اصطلاح شریعت میں ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے جب انسان دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اس قدر جھکتا ہے کہ پیٹھ اور گردن بالکل سیدھی ہو جائے۔ یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں۔

## نماز اور زکوٰۃ:

پہلے ایمان کی طرف بلایا تھا اب بتایا کہ صرف منہ سے مان لینا ہی کافی نہیں بلکہ ان دو باتوں کو بطور اصول قبول کرنا ضروری ہے جن کو اسلام نے پاکیزگی نفس یا کمال نفس کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یعنی نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ اول کمال حسن کے لیے، دوم کمال احسان کے لیے۔ کیونکہ نماز سے زیادہ تر غرض ان کمالات انسانی کا حصول ہے جو اپنے نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

﴿وَ ارْكَعُوْا﴾ میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے انسان کی گردن جھکی رہنی چاہیے۔

67- ﴿بِالْبِرِّ﴾ بِرٌّ نیکی میں وسعت یا بڑی نیکی کو کہتے ہیں۔ (غ) کیونکہ بَرٌّ خشکی کے وسیع قطعہ کو کہتے ہیں۔

﴿تَنْسَوْنَ﴾ نِسْيَانٌ انسان کا اس چیز کے ضبط کو چھوڑ دینا ہے جس کی اسے ودیعت کی گئی ہو۔ خواہ ضعف قلب سے یا لاپروائی سے یا ارادۃً یہاں تک کہ اس کی یاد دل سے جاتی رہے۔ (غ) وہ نسیان قابل مؤاخذہ ہے جو عمداً ہو جیسے: ﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ

وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگتے رہو اور یقیناً یہ بڑی

لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ [السجدة: 14:32] ''سو چکھو، اس لیے کہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولے رہے۔'' یہاں بھی وہی نسیان مراد ہے جو عمداً ہو کیونکہ دوسروں کو نصیحت کرنے والا عمداً ہی ترک کرتا ہے۔

﴿تَتْلُوْنَ﴾ تلی کے اصل معنی ہیں اس کی پوری پوری پیروی کی خواہ جسم سے ہو یا اقتدائے حکم سے۔ (غ) اور تلاوت کتب منزل من اللہ سے مخصوص ہے۔ خواہ قراءت سے ہو اور خواہ ان پر عمل کرنے سے۔ (غ) اس لفظ کو اللہ کی کتابوں سے مخصوص کر کے یہ بتا دیا کہ ان کی تلاوت کی اصل غرض ان کی پیروی ہے۔

﴿تَعْقِلُوْنَ﴾ عَقَلَ کے اصل معنی روکنا اور پکڑ لینا ہیں۔ جیسے عقال (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی) سے اونٹ کا روک لینا۔ (غ) حدیث میں ہے [أَعْقِلْ وَتَوَكَّلْ] جہاں اَعْقِلْ کے معنی گھٹنا باندھ دو ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں عقل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک اس قوت کو عقل کہا جاتا ہے جو قبول علم کے لیے انسان کو تیار کرتی ہے اور دوسرے اس علم کو بھی عقل کہا جاتا ہے جو اس قوت کے ذریعہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور لکھتے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عدم عقل کے لیے کفار کی مذمت کی ہے وہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں اور یہ بات صاف بھی ہے۔ قوت تو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے اندر رکھی ہے۔ قابل الزام وہی ہیں جو اس قوت سے کام نہیں لیتے۔

### واعظ کے لیے ضرورتِ عمل:

یہاں بالخصوص خطاب علماء سے ہے جو دوسروں کو لمبے چوڑے وعظ کرتے ہیں اور اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ اگر خطاب بنی اسرائیل کے علماء سے لیا جائے تو رسول ﷺ کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مگر میرے نزدیک خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح دونوں خطابوں کو ملانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کہا گیا ہے۔ جب تک واعظ خود عامل نہ ہو اس کا وعظ دوسروں پر بھی اثر نہیں کرتا۔

### مذہب میں عقل کے استعمال کی ضرورت:

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ اس قسم کے فقرات قرآن شریف میں بکثرت آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑا جوہر دیا ہے اور اس سے کام لیے بغیر انسان صداقت کو بھی نہیں پا سکتا اور نہ سچے مذہب کی اور سچے طریق کی اسے شناخت حاصل ہو سکتی ہے۔ مفردات میں حدیث نقل کی ہے: [مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَقْلِ] (المفردات للراغب: جلد1، صفحہ 342) اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کی نگاہ میں عقل سے زیادہ عزت والی ہو۔ اسی سے انسان کی فضیلت حیوان پر ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب میں عقل کا دخل نہیں صریح قرآن شریف کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ملزم کرتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

### عقل اور وحی:

ہاں یہ سچ ہے کہ وحی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو عقل خود دریافت نہیں کر سکتی۔ لیکن عقل کا عجز ان باتوں کے معلوم کرنے

لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵ مشکل ہے مگر نہ ان پر جن کے دل پگھلتے ہیں۔ (68)

---

سے اور چیز ہے اوران باتوں کا عقل کے مطابق ہونا اوران کی صداقت کو عقل سے معلوم کر لینا بالکل الگ ہے۔

وحی فطرت کی روشنی یعنی عقل کو جلا دینے والی اور تیز کرنے والی چیز ہے۔ایک کو دوسرے کا مخالف بنانا دونوں کی حقیقت سے بے خبر ہونے کا نتیجہ ہے۔

68- ﴿ بِالصَّبْرِ ﴾ صَبْر اصل میں تنگی کے اندر روک رکھنے کا نام ہے اور پھر اپنے آپ کو روک رکھنے کا نام ہے اس چیز پر جس کو عقل اور شریعت چاہتی ہوں۔(غ) بالفاظ دیگر طاعت پر قائم رہنے اور معصیت سے رکے رہنے کا نام صبر ہے۔پس صبر ایک عام لفظ ہے اور مصیبت میں استقلال، جنگ میں ثبات اور روزہ کو صبر کہا ہے۔

﴿ لَكَبِيْرَةٌ ﴾ كَبِيْرَةٌ کے اصل معنی بڑا ہیں۔مگر كَبِيْرٌ کا استعمال اس چیز پر بھی ہے جو سخت اور دشوار ہو۔کبر بھی اس معنی میں آیا ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ ﴾ [الأنعام: 35:6] ''اور اگر تجھ پر ان کا منہ پھیر لینا دشوار گزرتا ہے۔''

﴿ الْخٰشِعِيْنَ ﴾ خَشُوْعٌ عاجزی، فروتنی (غ) سکون اور فرمانبرداری ہے۔(ت) آواز کی پستی کے لیے اور نگاہ کے نیچا ہونے کے لیے یہ لفظ بالخصوص بولا جاتا ہے۔قرآن شریف میں ہے: ﴿ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ ﴾ [طٰهٰ: 108:20] ''اور آوازیں پست ہو جائیں گی۔'' ﴿ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ ﴾ [القلم: 43:68] ''ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوں گی۔''

## طریق استعانت:

قرآن کریم نے مومن کو مشکلات کے وقت جو طریق استعانت بتایا ہے وہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ ہے۔صبر اصول حقہ پر مضبوط رہنے کا نام ہے اور صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا۔صبر تو یہ چاہتا ہے کہ انسان ایک بات پر ایسا اڑا رہے کہ کسی مخالفت کی اور کسی روک کی اسے کچھ پروا نہ ہو۔تمام دنیا بھی اس کے خلاف ہو تو ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اس کے قدم میں جنبش نہ آئے اور صلوٰۃ یہ چاہتی ہے کہ وہ اس قدر عاجز ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا رہے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔جب انسانوں کے سامنے حد درجہ کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حد درجہ کی عاجزی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے تب کامیابی کی راہیں سہل ہو جاتی ہیں اور مشکلات کے پہاڑ بھی ہوں تو اُڑ جاتے ہیں۔

## مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت:

﴿ اِنَّهَا ﴾ میں ضمیر بعض مفسرین نے استعانت کی طرف لی ہے۔یعنی صبر وصلوٰۃ سے مدد چاہنا۔عام لوگوں کو دشوار معلوم ہوتا ہے مگر بعض نے اسے صرف صلوٰۃ کی طرف لیا ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے جیسا کہ سیاق عبارت بتاتا ہے۔کیونکہ خدا کے حضور عاجزی اختیار کرنا، مصائب میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس سے ملاقی ہونے کا بھی انہیں یقین حاصل ہوتا ہے۔یہاں استعانت ﴿ بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ کا حکم دے کر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ یہاں نبی کی شناخت یا اس پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ مقصد دعا سے ہی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ
ع 5 7 5 اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ع ۴۶

جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (69)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی اور یہ کہ میں نے تمہیں قوموں پر

---

دوسری دفعہ بعینہٖ یہی حکم دے کر [آیت نمبر: 153] صبر کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ وہاں جنگ کا ذکر ہے اور دشمن کے مقابلہ کا۔ جہاں گو دعا کی بھی ضرورت ہے مگر مقدم استقلال ہے۔

69- ﴿يَظُنُّوْنَ﴾ ظَنٌّ اس چیز کا نام ہے جو نشانات سے حاصل ہو اور جب یہ مضبوط ہو تو علم کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب بہت ہی کمزور ہو تو تو ہم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ (غ) ظَنٌّ شک اور یقین دونوں پر بولا جاتا ہے جب یقین مراد ہو تو ایسا یقین ہوتا ہے جو تدبر سے حاصل ہو نہ وہ جو دیکھنے سے حاصل ہو۔ کیونکہ جو یقین دیکھنے سے حاصل ہو اس پر صرف لفظ علم بولا جاتا ہے۔ (ت) یہاں ظن سے مراد یقین ہی ہے اور اس پر مفسرین کا قریباً اتفاق ہے۔

﴿مُّلٰقُوْا﴾ لِقَاءٌ کسی چیز کے سامنے آجانے اور اسے پالینے دونوں کو کہا جاتا ہے۔ لیکن الگ الگ دونوں مضمونوں کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

﴿رٰجِعُوْنَ﴾ رَجُوْعٌ لوٹ کر جانے کا نام ہے۔ اس کی طرف جس سے ابتدا ہو یا تقدیرا ابتدا خواہ بلحاظ مکان کے ہو یا فعل کے یا قول کے۔ (غ) رب کی ملاقات سے کیا مراد ہے؟ یہ ذکر قرآن شریف میں بار بار آتا ہے اور کافروں کو ملزم کیا ہے کہ وہ لقاء اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [یونس: 10:7] ''جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہیں۔'' سے معلوم ہوتا ہے کہ محض دنیا کی زندگی کو غرض و غایت سمجھ لینا انکار لقاء اللہ ہے۔ سورۂ کہف کے آخر میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو سارا زور دنیا کی زندگی پر ہی صرف کر دیتے ہیں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ﴾ [الکھف: 18:105] ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کی باتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا۔'' اور ایک جگہ فرمایا: ﴿اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴾ [الانشقاق: 84:6] ''تو سخت کوشش کر کے اپنے رب کی طرف پہنچنے والا ہے، پھر اسے ملنے والا ہے۔'' پس لقاء اللہ سے مراد اعلیٰ زندگی ہے جو مومنوں کو میسر آتی ہے اور گو کامل رنگ لقاء اللہ کا بعد موت یا قیامت میں ہی میسر آئے گا۔ لیکن جو لوگ اسی زندگی میں جنت کو پالیتے ہیں یعنی نفوس مطمئنہ وہ یہاں بھی خدا کے حضور ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پس لقاء اللہ یا اللہ کو پالینا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کا ہے۔

**رجوع الی اللہ:**

﴿اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ موت کے بعد سب انسانوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا آیت 28 میں بیان ہو چکا ہے۔ پس اس سے مراد

الْعٰلَمِيْنَ ۝٤٧ فضیلت دی۔ (70)

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝٤٨

اور اس دن سے بچاؤ کرلو جب کوئی جی کسی جی کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے بدل لیا جائے گا اور نہ انہیں مدد دی جائے گی۔ (71)

---

حساب و کتاب کے لیے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔

70- جیسا کہ نمبر 2 میں دکھایا جاچکا ہے ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم کہلاتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ کی قوموں پر فضیلت دی گئی۔ اس کے مقابل پر مسلمانوں کے متعلق فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران: 110:3] ''تم تمام قوموں میں سے جن کو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا بہترین قوم ہو۔'' بنی اسرائیل کو یہاں دوسری مرتبہ خطاب کیا ہے۔ پہلی مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ پیشگوئیاں یاد دلائی تھیں جو ان کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اب دوسری مرتبہ خطاب کرکے ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان کو دی تھیں۔

71- ﴿تَجْزِيْ﴾ جَزَا کے اصل معنی کام آنا، کافی ہونا۔ (غ) یا ادا کرنا اور عوض دینا ہیں۔ (ج) یہاں مراد یہ ہے کہ جو حق ایک کے ذمہ ہے اسے دوسرا کوئی ادا نہ کرسکے گا۔

﴿شَفَاعَةٌ﴾ شَفْعٌ (جفت) سے مشتق ہے شفع کے اصل معنی ہیں ایک شے کو اس جیسی دوسری شے سے ملا دینا۔ (غ) اور شفاعت کے معنی ہیں کسی دوسرے سے مل جانا اس کی مدد کرتے ہوئے اور اس کا حال دریافت کرتے ہوئے اور اکثر استعمال اس کا اس طرح پر ہے کہ ایک اعلیٰ عزت اور مرتبہ والا اس کے ساتھ ہوجائے جو ادنیٰ ہے اور اسی سے قیامت کی شفاعت ہے۔ (غ)

### مسئلہ شفاعت:

شفاعت کا مسئلہ شریعت اسلامی میں مسلم ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض گناہ ایک انسان کے پاک لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے معاف کردیئے جائیں۔ اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ نہ ایک کی ذمہ داری کو دوسرا ادا کرسکتا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ اس اصول کو باطل نہیں کرتا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی سفارش چل گئی وہ بچ گیا بلکہ جس طرح ہم اس دنیا میں شفاعت کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ مثلاً نبی کریم ﷺ کے ساتھ تعلق رکھنے والے کس طرح گناہوں سے پاک ہوگئے اور یہ محض آپ کی شفاعت یا آپ سے تعلق کا نتیجہ تھا اور آپ کی دعاؤں نے جو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حق میں آپ کرتے تھے یہ انقلاب پیدا کردکھایا۔ اسی سے قیامت کی شفاعت کا قیاس ہوسکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان کی نجات اللہ کے رحم اور فضل پر موقوف ہے۔ پھر یہ فضل و رحم اولاً انسان کے اعمال پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ پھر بعض نیکوں کے ساتھ سچے تعلق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب انسان نیک نیتی سے بعض غلطیاں کربیٹھتا ہے یا اپنی غفلت کی وجہ سے معذور

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑالیا جوتمہیں برادکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو مارڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمائش تھی۔(72)

---

ہوتا ہے گو دل میں نیکی کی تڑپ رکھتا ہے توصلحا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا رحم خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے خود بھی جوش مار کر اپنی مخلوق کی دستگیری فرماتا ہے۔ چنانچہ شفاعت کی حدیث ذیل جو بخاری اور مسلم میں آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے: [شَفَعَتِ الْمَلَآئِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّونَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُونَ وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَّمْ يَعْمَلُوا خَيْرًا قَطُّ] (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب مَعْرِفَةِ طَرِيقِ الرُّؤْيَةِ: 472) یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی، نبیوں نے بھی شفاعت کی، مومنوں نے بھی شفاعت کی اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہیں رہا۔ پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھرلے گا اور ایسے لوگوں کو باہر نکال لے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔ یہاں تین شفاعتوں کا ذکر ہے۔ ایک ملائکہ کی، ایک انبیاء کی، ایک مومنوں کی۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ کا تعلق بہت وسیع ہے یعنی کل نیکی کرنے والوں سے۔ انبیاء کا تعلق صرف اپنی اپنی امتوں سے اور مومنوں کا تعلق بہت ہی محدود ہے۔ پس ملائکہ ہر ایک نیکی کرنے والے کی شفاعت کریں گے، انبیاء اپنی اپنی امتوں اور مومن اپنے ساتھ خاص تعلق رکھنے والوں کی اور جنہوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی یعنی نہ ان کا تعلق کسی مومن سے ہوا نہ کسی نبی سے نہ ملائکہ سے جو نیکیوں کے محرک تھے ان پر خود اللہ تعالیٰ کا رحم جوش مارے گا۔ اس میں مفہوم شفاعت بتایا ہے کہ اصل غرض گنہگاروں پر رحم ہے جس کے لیے ایک یا دوسرا سامان خدا تعالیٰ نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں عیسیٰ مسیح والی شفاعت نہیں کہ صلیب اور کفارہ پر ایمان لانے والے تو سب بچ جائیں خواہ کچھ ہی کرتے رہے ہوں اور دوسرے لوگوں نے خواہ کتنی بھی نیکی کی ہوان پر رحم قطعاً نہ ہوگا اور نہ یہ شفاعت سفارش ہے جو ایک انسان پیش کر سکے۔ بلکہ یہ محض کامل مومنوں اور انبیاء کے اور خود خالق عالم کے رحم کے جوش میں آنے کا نتیجہ ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو توجہ دلائی ہے کہ ان کی نافرمانی کی حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خدا کے رحم سے وہ بالکل دور جا پڑے ہیں۔ انسان کے بچاؤ کے سامان یہی ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام آجائے، کوئی سفارشی ہو، کوئی معاوضہ لے لیا جائے، کوئی رحم کرکے مددگار بن جائے۔ مگر ان کو بتایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ان سب سامانوں سے محروم کر لیا ہے۔ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے اور سبق لینے کا مقام ہے۔

72- ﴿نَجَّيْنٰكُمْ﴾ نجات کا مادہ نجو ہے اور نَجْوَةٌ بلند زمین کو کہتے ہیں۔ پس نجات کے معنی [اَلْاِرْتِفَاعُ مِنَ الْهَلَاكِ] ہیں یعنی ہلاکت سے بلند ہو جانا۔ (ت) یا جس چیز میں خوف ہو اس سے مخلصی پالینا۔ راغب کہتے ہیں کہ نجاء کے اصل معنی کسی چیز سے

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔پس ہم نے

الگ ہوجانا ہیں۔پس نجات کے معنی اسلام میں گناہ سے جو ہلاکت پیدا کرتا ہے بلند ہوجانا یا اس سے بالکل الگ ہوجانا اور مخلصی پالینا ہے۔

﴿اٰلِ﴾ اَهْلٌ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ آل اور اَهْلٌ میں فرق یہ ہے کہ آل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل عام ہے۔نکرہ کی طرف یا مکان یا زمانہ کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے اور دوسرے آل کا لفظ اشرف اور افضل لوگوں کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اور اَهْلٌ ہر ایک کی طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا استعمال سوائے خصوصیت ذاتی کے نہیں ہوتا۔خواہ وہ قریبی قرابت کے لحاظ سے ہو یا دوستی اور تعلق کے لحاظ سے ہو۔

## آل محمد اور امت محمد:

اس لیے آل محمد ﷺ اور امت محمد ﷺ میں یہ فرق ہے کہ امت محمد ﷺ میں سب نام لیوا داخل ہیں۔مگر آپ کی آل میں وہی لوگ کہلائیں گے جو علم یقینی اور عمل مضبوط کی خصوصیت رکھتے ہوں۔(غ)

فرعون رعمیسس فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔وہ خاص فرعون جس کا یہاں ذکر ہے رعمیسس ثانی تھا۔

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ﴾ سَوْمٌ کے اصل معنی کسی چیز کی طلب میں نکلنا ہیں۔ پھر خالص جانے پر اور صرف طلب پر بھی اس کا استعمال ہوجاتا ہے۔ اور یہاں طلب کے معنی میں ہی ہے۔(غ) اور سَامَهُ کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ ایک سخت کام اس پر ڈال دیا۔(ر)

﴿يُذَبِّحُوْنَ﴾ ذَبَحَ کے اصل معنی جاندار چیز کا حلق کاٹنا ہے۔مگر محض کاٹنے یا محض ہلاکت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

﴿بَلَآءٌ﴾ بَلِیٌّ سے ہے جو کپڑے کے پرانا ہونے پر بولا جاتا ہے اور بَلی کے معنی آزمانا اس لیے آتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش سے اسے بڑھا کر دیا غم اور تکلیف کو بھی اسی لیے بلاء کہتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش بعض وقت بذریعہ مصائب کے ہوتی ہے اور بعض وقت خوشی اور راحت پہنچانے سے، اس لیے انعام کو بھی بلاء کہا جاتا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: [بُلِيْنَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا، وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ] (مسند الشاميين: جلد 4، صفحه 241) ''ہم تکلیف سے آزمائے گئے تو ہم نے صبر کیا اور آسائش سے آزمائے گئے، مگر ہم صبر نہ کر سکے۔'' اور قرآن شریف میں بھی ہے ﴿وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [الأنبيآء: 35:21] ''اور کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے ہم تمہیں دکھ اور سکھ سے آزماتے ہیں۔'' اور یہاں بلاء میں اس تکلیف و مشقت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے جس کا ذکر يُذَبِّحُوْنَ میں ہے اور اس انعام کی طرف بھی جس کا ذکر نجات دینے میں ہے۔

## بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا:

﴿سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ یا بڑا دکھ جس کا یہاں ذکر ہے۔ بائبل میں اس کے متعلق ہے:

اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۰ تمہیں بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔(73)

---

''اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔'' [خروج: 1:13, 14]

## بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا:

لڑکوں کے مارنے کا حکم بھی فرعون نے دیا تھا:

''تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو۔۔۔ یوں کہا کہ۔۔۔ اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور بیٹی ہو تو جینے دو۔''
[خروج: 1:15, 16]

فرعون اور اس کی قوم نہ چاہتی تھی کہ ایک دوسری قوم ان کے ملک میں قوت پکڑے اس لیے ذلت اور بیگار کے سب کام ان سے لینے شروع کیے۔ لڑکوں کو مارنے اور لڑکیوں کو جیتا رکھنے سے یہ بھی منشا تھا کہ قوم نابود ہو جائے۔ کیونکہ لڑکیاں مجبور ہو کر مصریوں کے نکاح میں آتیں۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔

73- ﴿فَرَقْنَا﴾ فَرَقٌ اور فَلَقٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن فرق علیحدہ ہونے کے لحاظ سے اور فلق پھٹ جانے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ (غ) مگر پانی کے پھٹ جانے سے مراد بھی اس کا ہٹ جانا ہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَانْفَلَقَ﴾ [الشعرآء: 26:63] ''دریا پھٹ گیا۔''

﴿الْبَحْرَ﴾ بحر اصل میں اس وسیع جگہ کا نام ہے جس میں بہت سا پانی جمع ہو۔ (غ) اس لیے دریا سمندر سب پر بولا جاتا ہے۔ پھر بلحاظ معنی وسعت پر بولا جاتا ہے جیسے: [تَبَحَّرَ فِي الْعِلْمِ] یعنی علم میں وسعت۔ اور گھوڑے کو جو بہت چلنے والا ہو بحر کہہ دیتے ہیں۔ جیسے آنحضرت ﷺ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو فرمایا: [وَإِنْ وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا] (صحيح البخاری، كتاب الهبة، باب مَنِ اسْتَعَارَ مِنَ النَّاسِ الْفَرَسَ: 2627) اور اسی لیے بحر کے معنی زیادہ پھاڑ دیا بھی ہیں جس سے بحیرہ آتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور شہروں اور بستیوں کو بھی بحار کہا جاتا ہے۔ (ن)

## بنی اسرائیل کا عبور دریا:

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے دریا پار ہونے کا ذکر کئی جگہ ہے۔ مگر کہیں یہ ذکر نہیں کہ دریا میں بارہ راستے بن گئے تھے اور پانی کی دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں اور ان میں دریچے بن گئے تھے۔ نہ کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون ہے یہاں ﴿فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ فرمایا یعنی دریا کو تم سے الگ کر دیا۔ دو جگہ فرمایا: ﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ﴾ [الأعراف: 7:138؛ یونس: 10:90] یعنی بنی اسرائیل کو ہم نے دریا پار کر دیا۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿فَانْفَلَقَ﴾ [الشعرآء: 26:63] یعنی دریا پھٹ گیا۔ دریا پھٹنے سے مراد یہی ہوتی ہے کہ خشک راستہ ہو گیا اور ایک جگہ فرمایا: ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ [طٰهٰ: 20:77] دریا میں ان کو

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا(74) پھر

خشک راستہ پر لے جاؤ۔ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ [الدخان: 24:44] دریا کو ٹھہرا ہوا یا درمیان میں چھوڑ کر پار ہو جاؤ۔ نہ کہیں بارہ رستوں کا ذکر ہے نہ پانی کی دیواروں کا۔ ہاں خشک راستہ کس طرح ہو گیا یا دریا کس طرح پھٹ گیا۔ یہ قرآن شریف نے بیان نہیں فرمایا۔ بائبل میں صرف اس قدر ہے کہ ''خداوند نے بہ سبب پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا۔'' [خروج: 21:14]

اس قدر صاف ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دشت سینا میں لائے۔ دریا درمیان میں کہاں حائل ہوا۔ بائبل اور مفسرین نے اسے بحیرۂ قلزم کا شمالی حصہ موجودہ شہر سویز سے کچھ اوپر قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں کوئی تنگ حصہ سمندر کا اس زمانہ میں ہو جہاں سے پانی کے آندھی سے جیسا کہ بائبل کہتی ہے یا جوار بھاٹے سے ہٹ جانے سے خشک راستہ نکل آیا ہو۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اتنی دور آنے کی مہلت نہیں دی اور شاید یہ واقعہ دریائے نیل سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور دریا سے جو درمیان میں حائل ہوا ہو۔ دریاؤں میں یہ بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ ایک وقت دریا پایاب ہو جاتا ہے اور آناً فاناً ایک ایسی خطرناک رو آتی ہے یا سیلاب آ جاتا ہے۔ جو دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں یہ واقعات اکثر پیش آ جاتے ہیں۔ خود دریائے نیل کے متعلق یہ امکان ہے کہ پرانے زمانے میں یہ اس قدر بڑا نہ ہو۔ اور کوئی حصہ اس کا پایاب ہو اور فرعون نے جوش تعاقب میں کہ بنی اسرائیل کو پکڑ لے یہ خیال نہ کیا ہو کہ رَو کا پتہ لے لے۔ بہر حال وہ اسباب جو اس طرح پر گزارنے اور فرعونیوں کو غرق کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اس سے احسان میں فرق نہیں آتا۔ اگر نبی کریم ﷺ کو دشمنوں سے غار میں چھپا کر بچا لینا، اگر مدینے کے گرد محاصرہ کی ہوئی فوج کو ایک آندھی سے ہٹا دینا انعامات الٰہی ہیں تو معمولی اسباب سے ایک نتیجہ کا پیدا ہو جانا کسی طرح احسان کی نوعیت نہیں بدل سکتا۔

74- ﴿وٰعَدْنَا﴾ وَعَدَ سے باب مفاعلہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس کا قبول کرنا۔

﴿مُوْسٰى﴾ عبرانی نام ہے۔ ہمارے مفسر اس کو مو بمعنی مآء یعنی پانی اور شیء بمعنی شجر سے مرکب بتاتے ہیں اور بعض اس کو ماس یمیس سے فعلی کا وزن بتاتے ہیں۔ مفسرین بائبل اس کو مَاشَہُ (نکلنا) سے مشتق بتاتے ہیں اور تازہ تحقیقات یہ ہے کہ یہ مصری لفظ ہے جس کے معنی بچہ یا بیٹا ہیں۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہایت اولوالعزم نبی ہیں۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا اور مصر میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کی بہن مریم آپ سے بہت بڑی تھیں۔ اور ہارون آپ سے تین سال بڑے تھے۔ آپ کا زمانہ عموماً پندرہ سو قبل مسیح سمجھا گیا ہے۔ مگر تازہ تحقیقات یہ ہیں کہ آپ کا زمانہ تیرہ سو قبل مسیح کے قریب ہے۔

رعمیسس **ثانی کا زمانہ:** کیونکہ رعمیسس ثانی کا زمانہ جس کے ساتھ آپ کو معاملہ پیش آیا ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح ہے۔ آپ کا عظیم الشان کام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کروانا اور ایک شریعت اپنی قوم کو دینا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا ذکر بہت آتا ہے۔ جس کی وجہ آپ سے آنحضرت ﷺ کی مماثلت ہے۔

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱

تم نے اس کے پیچھے بچھڑا بنالیا اور تم ظالم تھے۔ (75)

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲

پھر ہم نے تم کو اس کے بعد معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔ (75أ)

---

﴿لَيْلَةً﴾ عموماً غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے وقت کو کہا جاتا ہے۔ یوں تو چالیس راتوں میں چالیس دن بھی شامل ہیں۔ مگر عبادت کے لیے چونکہ رات زیادہ موزوں ہے شاید اس مناسبت سے لَیۡلَۃٌ کا لفظ اختیار کیا۔ [الأعراف: 142:7] میں چالیس کی جگہ تیس اور دس کہا: ﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ ٹھہرایا اور اس کو دس (اور) سے پورا کیا۔''

## نزول شریعت موسوی:

بائبل میں حضرت موسیٰ کا چالیس دن پہاڑ پر رہنا مذکور ہے:

''اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا۔'' [خروج: 18:24]

یہ وہ خلوت کا زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کے احکام نازل ہوئے اور یہ واقعہ مصر سے آنے کے بعد کا ہے۔ پہلا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد صرف یہی کیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال لائیں۔ جب وہ نکال لائے تب شریعت نازل ہوئی۔

75- ﴿اتَّخَذْتُمُ﴾ اِتِّخَاذٌ کا جب ایک مفعول ہو تو بنانے کے معنی میں آتا ہے۔ (ذ) پس مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایک بچھڑے کی مورت بنائی۔

## بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش:

مصر میں جہاں بنی اسرائیل چار سو سال رہے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کا اثر بنی اسرائیل پر ہوا۔ جیسے ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا اثر مسلمانوں پر ہوا ہے۔ پیر پرستی، قبر پرستی کی ترویج عام کا یہ بھی ایک موجب ہے۔ اور بہت سے رسوم و رواج ہندوؤں کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لیے پہاڑ پر گئے تو بنی اسرائیل نے ایک بچھڑے کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی تفصیل قرآن شریف میں سورہ طٰہٰ میں اور بائبل میں کتاب خروج کے باب 32 میں ہے۔

75-أ ﴿عَفَوْنَا﴾ عَفْوٌ کے اصل معنی کسی چیز کے لے لینے کا قصد کرنا ہیں۔ (غ) اس لیے دو متخالف معنوں پر بولا جاتا ہے یعنی مٹانا اور بڑھانا۔ اسی دوسرے معنی کی رو سے حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے [اِعْفَاءُ اللُّحٰی] کا حکم دیا جس کے

وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا تا کہ تم ہدایت پاؤ۔(76)

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے۔ پس اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پھر آؤ اور اپنے نفسوں کو مار ڈالو(77) یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے حضور بہتر ہے۔ پس وہ تم پر رحمت سے متوجہ ہوا، بے شک وہ رحمت سے متوجہ ہونے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

معنی ابن اثیر نے کیے ہیں: [هُوَ أَنْ يُوَفِّرَ شَعْرَهُ وَلَا يَقُصَّ كَالشَّوَارِبِ] (ن) یعنی یہ کہ داڑھی کے بالوں کو زیادہ کیا جائے مونچھوں کی طرح چھوٹا نہ کیا جائے اور عَفَوْتُ عَنْهُ کے معنی ہیں میں نے اس کے گناہ کے دور کرنے کا قصد کیا۔ (غ) گویا اسے مٹا دیا۔

﴿تَشْكُرُوْنَ﴾ شُكْرٌ کے معنی ہیں نعمت کا تصور اور اس کا ظاہر کرنا۔ (غ) پس ایک شکر قلب یعنی دل کا شکر ہے جو محض تصور نعمت ہے اور ایک شکر لسان یعنی زبان کا شکر ہے جو دینے والے کی ثنا ہے اور ایک شکر بالجوارح یعنی اعضا سے شکر ہے۔ جس سے مراد نعمت کی مکافات اس کے استحقاق کے مطابق دینا ہے۔ (غ) اور شکر نعمت کفر نعمت کے مقابل پر ہے یعنی نعمت کو چھپانے کے۔ (غ) اس لیے شکر احسان یعنی نعمت کا پہچاننا اور اس کا پھیلانا۔ (ت) اور اللہ تعالیٰ شکور ہے یعنی تھوڑے عمل پر بہت بڑی جزا دینے والا۔ (ت) یہی معنی شاکر کے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو۔

76- ﴿الْفُرْقَانَ﴾ حق و باطل میں فرق کو کہتے ہیں۔ (غ) فرق عام ہے قرآن شریف میں جنگ بدر کو بھی فرقان کہا ہے: ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ [الأنفال: 41:8] ''فرق کرنے کے دن، جس دن دو گروہوں میں مڈھ بھیڑ ہوئی۔'' اور خود قرآن شریف کو بھی فرقان کہا ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ [الفرقان: 1:25] ''وہ (ذات) بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا۔'' مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنے کا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان کہا ہے: ﴿اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ [الأنفال: 29:8] ''اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہارے لیے (حق و باطل میں) فرق کر دے گا۔'' پس موسیٰ کو فرقان دینے سے مراد وہ معجزہ بھی ہوسکتا ہے جس سے بنی اسرائیل کے دشمن تباہ ہو گئے اور فرقان توریت کا نام بھی ہوسکتا ہے اس لحاظ سے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز ہے اور وہ نور بھی مراد ہوسکتا ہے جس سے انبیاء حق و باطل میں فرق کرتے ہیں۔

77- ﴿لِقَوْمِهٖ﴾ قَوْمٌ، قَامَ يَقُوْمُ سے ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں اور یہ اسم جمع ہے۔ زبان عربی میں قوم کا لفظ صرف مردوں کی

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں پس تم کو

---

جماعت پر بولا جاتا تھا۔ جس میں عورتیں شامل نہ ہوں کیونکہ وہی متکفل امور سمجھے جاتے تھے مگر قرآن شریف نے عموماً مردوں اور عورتوں دونوں کو اس لفظ قوم میں شامل کیا ہے۔ (غ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی حیثیت کو قرآن شریف نے کس طرح بڑھایا ہے۔

﴿ بَارِئِكُمْ ﴾ اَلْبَارِئُ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ بَرَأَ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ایسے طور پر پیدا کیا جس کی پہلے مثال یا نمونہ نہ ہو۔ (ت)

## خلق اور برأ میں فرق:

خَلَقَ اور بَرَأَ میں یہ فرق ہے کہ خلق عام ہے اور بَرَأَ حیوانات سے مخصوص ہے۔ (ل) گویا البارئ روح کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہاں بعض وقت جواہر اور اعراض کے پیدا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ل) قرآن کریم میں مصیبت کے متعلق آتا ہے: ﴿ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ﴾ [الحديد: 22:57] ''اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔''

﴿ اقْتُلُوْٓا ﴾ قَتْلٌ کے اصل معنی روح کا جسم سے دور کرنا ہیں۔ (غ) یا موت کا وارد کرنا مارنے سے یا پتھر سے یا زہر سے یا اور کسی طرح پر۔ (ت) مگر بعض وقت یہ معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً حدیث سقیفہ میں [قَتَلَ اللّٰهُ سَعْدًا] (مسند أحمد: جلد1، صفحہ 454) کے معنی ابن اثیر نے لکھے ہیں: [أَيْ رَفَعَ اللّٰهُ شَرَّهُ] یعنی اللہ تعالیٰ اس کے شر کو دور کرے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: [اُقْتُلُوْا سَعْدًا قَتَلَهُ اللّٰهُ] یعنی سعد کو قتل کر دو مطلب یہ نہ تھا کہ فی الواقع قتل کر دو بلکہ ایسا کر دو گویا کہ وہ قتل ہو گیا ہے اور مر گیا ہے۔ ایسا ہی دوسری حدیث میں جہاں دو خلیفوں کی بیعت کا ذکر ہے وہاں لفظ آتے ہیں: [فَاقْتُلُوا الْآخَرَ] دوسرے کو قتل کر دو جس کے معنی ابن اثیر لکھتے ہیں: [اَبْطِلُوا دَعْوَتَهُ وَاجْعَلُوْهُ كَمَنْ مَاتَ] (ن) یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور اسے اس کی طرح کر دو جو مر گیا ہے۔ اور قَتَلْتُ فُلَانًا کے معنی ذَلَّلْتُهُ آتے ہیں۔ (غ) یعنی میں نے اس کو فرمانبردار بنا لیا۔

## قتل نفس سے مراد:

اسی لیے ﴿ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ میں امام راغب نے یہ معنی بھی قبول کیے ہیں [قِيْلَ اَعْنِيْ بِقَتْلِ النَّفْسِ إِمَاطَةَ الشَّهَوَاتِ] یعنی قتل نفس سے مراد شہوات کا دور کرنا یا مارنا ہے۔

﴿ اَنْفُسَكُمْ ﴾ اَنْفُس۔ نَفْسٌ کی جمع ہے اور نفس کے معنی روح بھی ہیں اور ایک چیز کے کل کے کل یا اس کی حقیقت پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ت) جیسے ﴿ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ یعنی اپنے آپ پر ظلم کیا اور أَخٌ یا بھائی بند کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ﴿ فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ﴾ [النور: 61:24] ''تو اپنے لوگوں کو سلام کہا کرو۔'' ایسا ہی ﴿ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ

اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾ ہولناک آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ (78)

---

خَيۡرًا﴾ [النور: 12:24] ''تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک ظن کیوں نہ کیا؟'' میں اَنۡفُسٌ سے مراد اہل ایمان اور اہل شریعت لیے گئے ہیں۔ ﴿فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ میں مراد بھائی بند بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے نفس بھی جیسا ﴿ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ میں مراد ہے۔

## قتل نفس کی مزید تشریح:

توریت میں ہے کہ بنی لاوی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ:

''تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار مرد مارے پڑے۔'' [خروج: 27:32, 28]

پس ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ درست ہو اور قرآن کریم نے ﴿فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ میں اسی طرف اشارہ کیا ہو یعنی اپنے لوگوں کو جو اس شرک کے بانی مبانی اور قوم کو گمراہ کرنے والے ہیں قتل کر دو۔ مگر دوسرے معنی جو امام راغب نے بھی نقل کیے ہیں کہ قتل نفس سے مراد [إِمَاطَةَ الشَّهَوَاتِ] ہے۔ بلحاظ سیاق و سباق بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اول تو ﴿ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ میں نفسوں پر جس ظلم کا ذکر ہے اس سے مراد بھی ذلیل خواہشات میں مبتلا ہونا ہے۔ اور پھر توبہ کا یہاں صاف طور پر ذکر بھی ہے اور اس کے بعد گویا بتایا کہ توبہ ایسی ہو کہ دوبارہ اس قسم کی ذلیل حرکت تم سے سرزد نہ ہو۔ اس لیے اپنے نفسوں کو بہت فرمانبردار بناؤ۔ اور اگلے الفاظ ﴿فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ﴾ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اور سورہ اعراف میں جہاں اس واقعہ کا زیادہ تفصیل سے بیان ہے صرف توبہ ہی کا ذکر ہے [دیکھو الاعراف: 153:7] یوں یہ دوسرے موقع کی تفصیل بھی دوسرے معنی کو ترجیح دیتی ہے۔

78- **بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال:** ﴿لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ محض آپ کے کہہ دینے سے ہم یہ نہ مانیں گے کہ خدا آپ سے کلام کرتا ہے۔ جب تک کہ خود بھی خدا کو نہ دیکھ لیں۔ یہ کہنے والے سارے بنی اسرائیل نہیں بلکہ وہ ستر آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم میں سے منتخب کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے: ﴿وَ اخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا﴾ [الأعراف: 155:7] اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے میقات کے لیے چن لیے۔ یہ میقات اور وٰعَدۡنَا والا مواعدہ ایک ہی ہیں۔ یہ ستر آدمی حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے اور انہوں نے یہ لفظ کہے کہ جب تک ہم خدا کو اس طرح نہ دیکھ لیں جس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک محض تمہارے کہنے سے نہیں مان سکتے۔

## حضرت موسیٰ کا ان کی درخواست پر سوال ﴿رَبِّ اَرِنِيۡ﴾ کرنا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی ضد دیکھ کر آخر یوں سوال کیا ﴿رَبِّ اَرِنِيۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ﴾ [الأعراف: 143:7] ''میرے ربّ! مجھے (اپنا آپ) دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں۔'' جیسے حضرت مسیح نے حواریوں کی درخواست پر نزول مائدہ کے لیے التجا کی حالانکہ اس کو ناپسند بھی فرماتے تھے جیسا کہ ان کے قول ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ [المآئدة: 112:5] ''اللہ کا تقویٰ کرو

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

پھر ہم نے تم کو تمہاری موت (کی سی حالت) کے بعد اٹھایا، تاکہ تم شکر کرو۔ (79)

---

اگر تم مومن ہو۔'' سے ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی ایک تجلی دکھائی جس سے پہاڑ میں زلزلہ آ گیا۔ ﴿جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ میں یہی اشارہ ہے اور یوں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے کاموں اور عجیب قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

## صاعقہ اور رجفہ ایک ہی ہیں:

اسی کو یہاں صَاعِقَةٌ کہا ہے۔ سورہ اعراف میں اسی کو اَلرَّجْفَةُ یعنی زلزلہ بھی کہا ہے ﴿فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ [الأعراف: 155:7] جب ان کو زلزلہ نے آلیا۔ اسی طرح قرآن شریف میں ثمود کے عذاب کو ایک جگہ رَجْفَةٌ یعنی زلزلہ کہا ہے ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ [الأعراف: 78:7] اور دوسری جگہ اسی کو صَاعِقَةٌ کہا ہے۔ ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ [الذاريات: 4451] پس صَاعِقَةٌ کے صحیح معنی ہولناک آواز ہیں اور شدید زلزلہ سے پہلے بھی ایک ہولناک آواز آتی ہے۔ اس لیے زلزلہ کو صَاعِقَةٌ کہا گیا ہے اور بائبل میں بھی زلزلہ کا ذکر ہے: ''اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔'' [خروج: 18:19]

79- ﴿بَعَثْنٰكُمْ﴾ بَعَثَ کا لفظ موت سے اٹھانے اور نیند سے اٹھانے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ (ت) ایسا ہی بیہوشی سے ہوش میں لانے پر بولا جاتا ہے۔ (ض)

## موت کے مختلف معنی:

﴿مَوْتِكُمْ﴾ امام راغب نے مَوْتٌ کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ اول قوت نامیہ کا نہ ہونا، جیسے ﴿يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الحديد: 17:57] ''زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔'' دوم قوت حسی کا زائل ہونا یعنی بیہوش ہوجانا یہی معنی ﴿يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا﴾ [مريم: 23:19] ''اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی۔'' میں لیے گئے ہیں۔ سوم قوت عقلی کا زائل ہونا یعنی جہالت۔ جیسے ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ [الأنعام: 122:6] ''اور کیا وہ جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کردیا۔'' میں چہارم وہ غم جو زندگی کو مکدر کردیتا ہے جیسے ﴿وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ﴾ [إبراهيم: 17:14] ''اور ہر طرف سے اسے موت آرہی ہوگی اور وہ مرے گا نہیں۔'' پنجم اس کے معنی نیند ہیں۔ چنانچہ نیند کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل یعنی بھاری نیند کہا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: [اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا] (صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب:مَا يَقُولُ إِذَا نَامَ، حديث:6312) جو سو کر اٹھنے کی دعا ہے۔ یعنی سب تعریف اس کے لیے ہے جس نے ہم کو زندہ کیا بعد اس کے کہ ہم کو مار دیا تھا۔ احیا اور اماتت دونوں کا ذکر ہے مگر مراد صرف بیداری اور نیند ہیں۔ ششم معمولی معنی یعنی روح کی جسم سے مفارقت۔ اور لسان العرب میں ہے کہ موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوال شاقہ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فقر اور ذلت اور سوال اور بڑھاپا اور معصیت وغیرہ۔ اور موت کے معنی غشی بھی ہیں۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا(80) اور من اور سلویٰ تم پر اتارا(81) ان ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی

## بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی:

یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اوپر ذکر تھا کہ ان کو صاعقہ نے آلیا۔ صاعقہ سے موت کا نہ واقع ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ فرمایا: ﴿وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ جب صاعقہ نے آ پکڑا تو تم دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھنا حالت زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ نصف پہلے مر گئے اور دوسرے نصف ان کو دیکھتے رہے پھر وہ پہلے مرے ہوئے زندہ ہو گئے اور دوسرے نصف مر گئے۔ یہ بے فائدہ تکلف ہے۔ موت کے معنی یہاں قوت حسی کا جاتے رہنا ہے۔ زلزلہ کی شدت سے ان کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کو ہوش وحواس دے دیئے۔ یا قوت عقلی کا جاتے رہنا ہے۔ یعنی یہ سوال تمہارا جہالت کا سوال تھا اور تم ایک جہالت کی موت میں تھے خدا نے تمہیں اس سے باہر نکالا اور تم کو نور ایمان عطا فرمایا جیسے: ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ﴾[الأنعام: 6:122] میں جہاں ایک مردہ کو زندہ کرنے کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہم نے اس کو ایک نور دیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے گویا یہی نور ایمان کا ملنا ہی حیات ہے۔ یہ معنی روح المعانی میں بھی دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ نظم ونثر میں یہ معنی مروج ہیں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں [أَخُو الْعِلْمِ حَيٌّ خَالِدٌ بَعْدَ مَوْتِهِ ... وَأَوْصَالُهُ تَحْتَ التُّرَابِ رَمِيْمٌ ... وَذُو الْجَهْلِ مَيِّتٌ وَهُوَ مَاشٍ عَلَى الثَّرٰى ... يُظَنُّ مِنَ الْأَحْيَاءِ وَهُوَ عَدِيْمُ] (القرط على الكامل، باب ابن السيد ابوالعلاء، جلد1، صفحہ32) اور ابن جریر میں ایک قول ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے: [ثُمَّ بَعَثْنَاكُم أَنْبِيَآءَ] (تفسير الطبرى: جلد2، صفحہ 85) یعنی تم میں سے نبی اٹھائے کیونکہ لفظ بعث نبیوں کے بھیجنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

80- ﴿ظَلَّلْنَا﴾ ظِلٌّ سے ہے جس کے معنی سایہ ہیں۔ فیٔ بھی سایہ کو کہتے ہیں مگر فیٔ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو دھوپ سے رکاوٹ ہو اور ظِلٌّ عام ہے جہاں سورج نہ پہنچے اس لیے ظِلُّ اللَّيْلِ اور ظِلُّ الْجَنَّةِ کہا جاتا ہے۔ (غ)

﴿الْغَمَامَ﴾ غَمَامَةٌ کی جمع ہے یعنی بادل۔ غَمٌّ سے ہے جس کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں۔ بادل سورج کی روشنی کو ڈھانکتا ہے۔ (غ) اَمْرٌ غُمَّةٌ مشتبہ یا تاریک امر ﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾[يونس: 10:71] ''پھر تم کو اپنے کام میں شبہ نہ رہے۔''

## بادل کا سایہ:

مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو دشت سینا میں سے گزرنا پڑا۔ جہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے اور خیموں میں رہائش ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ شدت گرمی کے وقت ایسے بیابان میں بادل بڑی نعمت الٰہی ہے۔ قرآن شریف نے بائبل کے عجیب و غریب بادل کا ذکر نہیں کیا جو دن کے وقت سایہ کا کام دیتا ہو اور رات کے وقت روشنی کا۔

81- ﴿الْمَنَّ﴾ اصل میں مَنٌّ ایک مشہور وزن ہے۔ اور اس لیے بھاری نعمت کے دینے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ گویا نعمت کے

رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ہیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتے تھے۔(82)

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ

اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس سے جہاں چاہو بافراغت کھاؤ(83) اور دروازے میں

---

بوجھ کے نیچے دبا دیا۔ اور مَنّ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو شبنم کی طرح ایک درخت پر اترتی ہے اور اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ (غ) جیسے ترنجبین۔ بخاری میں ہے: [الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب وَقَوْلِهِ تَعَالَى: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى...: حديث: 4478) یعنی کھمبی بھی من سے ہے۔

﴿السَّلْوٰى﴾ اس کا مادہ سَلَا ہے اور سَلْوٰی کے اصل معنی وہ چیز ہیں جو انسان کو تسلی دے۔ (غ) اور سَلْوٰی ایک پرند ہے جو بٹیر سے مشابہ ہے۔

### من وسلویٰ کا اترنا:

راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ من اور سلوی ایک ہی چیز ہے من اس کو اس لیے کہا کہ اس کے ساتھ ان پر احسان کیا اور سلوی اس لیے کہ اس کے ساتھ ان کو تسلی دی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول سلا کے ماتحت نقل کر کے کہ من وہ ہے جو اوپر سے اترتا ہے اور سلویٰ پرند ہے۔ بعض محققین کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو گوشت اور نبات یعنی سبزیوں سے رزق دیا ہے اور یہ صرف بطور ایک مثال کے ہے۔

82- ﴿طَيِّبٰتِ﴾ طَيِّبٌ وہ چیز ہے جس سے حواس کو لذت حاصل ہو اور جس سے نفس کو لذت حاصل ہو اور شریعت میں طعام طیب وہ ہے جو اس طرز سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس اندازہ سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس مکان سے لیا جائے جو جائز ہے۔ (غ) سڑی بسی چیزوں پر لفظ طیب نہیں بولا جا سکتا۔

### طیبات کا حکم:

بائبل میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے لالچ کر کے ان چیزوں کو ذخیرہ کرنا شرع کیا تو وہ چیزیں سڑ کر خراب ہو جاتیں۔ ستھری چیزوں کے کھانے کے حکم میں یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ طیب وہ چیز ہے جو سڑی گلی یا مضر صحت نہ ہو۔ یہاں ایک عام اصول سمجھایا ہے کہ خلاف ورزی احکام الٰہی سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا وہ غنی ہے بلکہ انسان خود ہی نقصان اٹھاتا ہے ایسا ہی فرمانبرداری سے انسان خود ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔

83- ﴿الْقَرْيَةَ﴾ قُرٰی سے ہے جس کے معنی جمع کرنا ہیں اور قَرْيَةٌ اس مقام کو جس میں لوگ جمع ہوں مع ان لوگوں کے جو جمع ہوں کہتے ہیں مگر ان دونوں معنوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے۔ کبھی مراد صرف موضع ہوتا ہے اور کبھی صرف لوگ۔ (غ)

سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

فرمانبردار بن کر داخل ہو(84) اور کہو ہماری خطائیں معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے(85) اور احسان کرنے والوں کو اور زیادہ بھی دیں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع 6/13/6

پھر ان لوگوں نے جو ظالم تھے بات کو بدل کر اس کے خلاف بنا دیا جو انہیں کہا گیا تھا(86) پس ہم نے ان پر جو ظالم تھے اوپر سے ایک عذاب اتارا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔(87)

---

﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ کسی مشہور بستی کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے اور وہ مشہور بستی بیت المقدس ہی ہے جس میں داخل ہونے کا دوسری جگہ صاف حکم ہے۔ ﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾[المآئدۃ: 21:5] ''اے میری قوم! پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔'' ان کو کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس میں داخل ہوں جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت فاتح داخل ہوں۔ اگلی آیت بتاتی ہے کہ انہوں نے اس حکم کو نہ مانا جیسا کہ مائدہ میں بھی ان کا انکار موجود ہے اور یا سطیم مراد ہے۔[گنتی: 25-1]

84- امام راغب نے سُجَّدًا کے معنی کیے ہیں: [مُتَذَلِّلِيْنَ، مُنْقَادِيْنَ] یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اختیار کرتے ہوئے یا تعمیل حکم کرتے ہوئے۔ یہی معنی یہاں درست ہیں اسی کے مطابق سورہ مائدہ میں ہے: ﴿ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ﴾[المآئدۃ: 23:5] ''ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ۔'' یہ مراد نہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔

85- ﴿حِطَّةٌ﴾ حَطٌّ کے معنی اوپر سے نیچے اتارنا ہیں۔(غ) اور حِطَّةٌ کے معنی ہیں: [حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا]۔(غ) یعنی ہمارے گناہ دور کیے جائیں۔ اسی کے قریب قریب معنی حسن، قتادہ وغیرہم سے مروی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مغفرت مانگنا معنی مروی ہیں۔ ﴿نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ﴾ جو حِطَّةٌ کی دعا کا جواب ہے۔ اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔

86- **بنی اسرائیل کا جنگ میں جانے سے انکار:** بات کے بدل دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے قبول نہ کیا۔ فاتح بن کر داخل ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تفصیل مائدہ میں ہے اور اس کی بجائے زراعت وغیرہ کو چاہا کہ کھانے کی چیزیں ملیں[المآئدۃ: 61:5] بخاری کی حدیث میں جو آتا ہے کہ حِطَّةٌ کی جگہ انہوں نے [حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ] کہا یعنی بالی میں دانہ جو زراعت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو تبدیلی انہوں نے چاہی وہ یہی تھی کہ بجائے جنگ میں جانے کے ہم زراعت کریں گے اور یوں جنگ کو ناپسند کیا۔[دیکھو نمبر: 90] اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾[المآئدۃ: 24:5] یعنی ہم جنگ نہیں کریں گے۔ تم اور تمہارا رب جنگ کرو۔

87- ﴿رِجْزًا﴾ کے اصل معنی اضطراب ہیں اور اس عذاب کو رجز کہا جاتا ہے جو اپنی شدت کی وجہ سے قلق پیدا کرے۔(ت) اور

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝٦٠

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا، تو ہم نے کہا اپنا عصا چٹان پر مار۔ پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔ اللہ کے دیئے سے کھاؤ اور پیئو اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ (88)

---

ایسے عمل کو بھی جو ایسا عذاب پیدا کرے رجز کہا جاتا ہے۔ اور نسائی کی حدیث میں طاعون کو بھی رجز کہا ہے۔

﴿مِّنَ السَّمَآءِ﴾ یا اوپر سے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ قضاء وقدر اٹل ہوگی۔ روح المعانی میں ہے: [إِشَارَةٌ إِلَى الْجِهَةِ الَّتِيْ يَكُوْنُ مِنْهَا الْقَضَآءُ أَوْ مُبَالَغَةٌ فِيْ عُلُوِّهٖ بِالْقَهْرِ وَالْاِسْتِيْلَآءِ يَعْنِيْ مِنَ السَّمَآءِ] (روح المعانی: جلد1، صفحہ 267) میں اشارہ ہے اس جہت کی طرف جہاں سے قضا آتی ہے یا مبالغہ ہے اس کے علو میں قہر اور غلبہ کے ساتھ۔

**رجز کا عذاب:**

دوسری جگہ ہے کہ وہ چالیس سال جنگل میں بھٹکتے پھرتے رہیں گے۔ یہی وہ قلق پیدا کرنے والا عذاب ہے اور اگر ﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ سے سطّیم مراد لیا جائے تو عذاب طاعون ہوگا جس سے اسرائیلی وہاں ہلاک ہوئے۔ [گنتی: 25-9]

88- ﴿اضْرِبْ﴾ ضَرَبَ ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہتے ہیں اور [ضَرَبَ فِي الْأَرْضِ] کے معنی زمین میں چلنا ہیں۔ (غ) بلکہ تاج العروس میں ضَرَبَ بمعنی ذَهَبَ لکھا ہے یعنی چلا گیا۔ اسی لیے ضَرَبَ الْغَائِطَ کے معنی ہیں قضائے حاجت کے لیے گیا اور ضَرَبَ کے معنی مارنا بھی آتے ہیں۔

﴿بِّعَصَاكَ﴾ عَصَا: آئمہ لغت نے عَصَا کے اصل معنی اجتماع اور ائتلاف لکھے ہیں۔ (ل) یعنی اکٹھا ہونا۔ بلکہ اصمعی کہتے ہیں کہ عَصَا کے معنی سونٹا (لاٹھی) اس لیے آتے ہیں کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ (ل) اس لیے عَصَا کے معنی جماعت اور عَصَوْتُ کے معنی میں نے جمع کیا لغت میں آتے ہیں۔ خوارج کے متعلق آتا ہے: [سَقَوْا عَصَا الْمُسْلِمِيْنَ] یعنی انہوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ایسا ہی: [إِيَّاكَ وَقَتِيْلَ الْعَصَا] کے معنی ہیں کہ جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے والوں سے بچو۔ پس عَصَا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہو سکتے ہیں۔

اس لیے ﴿اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ کے معنی تین طرح ہو سکتے ہیں۔ اپنا سونٹا چٹان پر مارو۔ اپنے سونٹے سے چٹان پر چلے جاؤ۔ اپنی جماعت کے ساتھ چٹان پر چلے جاؤ۔

﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ اِنْفَجَرَتْ۔ فَجْرٌ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا فراخ پھٹ جانا اور فجر صبح کو کہتے ہیں کہ وہ رات کو پھاڑ دیتی

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پس اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے ان

---

ہے۔(غ) تَفْجِيْرٌ اور اِنْفِجَارٌ میں وسعت پائی جاتی ہے۔سورہ اعراف میں اسی موقع پر ﴿فَانْۢبَجَسَتْ﴾ ہے اس کے معنی بھی پھوٹ نکلنا ہیں۔مگر یہ اول خروج پر بولا جاتا ہے (جو تھوڑا ہوتا ہے) اور تُفَجِّرَ یا اِنْفِجَارٌ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو منبع سے نکل کر باہر آجاتا اور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور فُجُوْر جس سے فَاجِر ہے دیانت کے پردے کو پھاڑنا ہے۔(غ)

﴿عَيْنًا﴾ عَيْنٌ اصل معنی آنکھ ہیں۔ پانی نکلنے کی جگہ کو اسی لحاظ سے عین کہا جاتا ہے کیونکہ آنکھ سے بھی پانی نکلتا ہے۔ جاسوس کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ وہ خصوصیت سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔سونے کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ افضل الجواہر ہے جس طرح آنکھ افضل الاعضا ہے۔کسی چیز کی ذات کو بھی اس کا عین کہتے ہیں۔(غ)

﴿اُنَاسٍ﴾ اَلنَّاس کی دوسری صورت ہے اُنَاسٌ یا اَلنَّاس بعض وقت بمعنی قبیلہ اور طائفہ بھی آجاتا ہے۔(ت) یہاں یہی معنی لیے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارہ قبیلے علیحدہ علیحدہ چشمہ پر خیمہ زن ہوئے تھے۔اس لیے وہ بارہ چشمے الگ الگ مقامات پر اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں گے۔

﴿تَعْثَوْا﴾ عَثٰى سے ہے۔ عَثٰى اور عَيْثٌ دونوں کے معنی فساد ہیں۔(غ) یا اس کے معنی حد سے گزر جانا ہیں اور پھر فساد میں حد سے گزر جانے پر بولا گیا ہے۔

## ابتدائی مذاہب میں دعائیں:

اس آیت میں بنی اسرائیل کے پانی مانگنے کا ذکر ہے۔اگلی آیت میں کھانا مانگنے کا۔تمام ابتدائی مذاہب میں کھانے پینے کی دعائیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے بڑی دعا بھی روزانہ روٹی کے لیے ہے۔

## بارہ چشموں کا معجزہ:

بیابان میں پانی کی ضرورت ایک اہم ضرورت تھی۔قوم کا ٹھکانا سوائے پانی کے نہ ہو سکتا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی خاص پہاڑ پر جانے کی ہدایت فرمائی جہاں ان کو بارہ چشمے مل گئے۔ایلیم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے۔ [خروج: 15:25-27] اور آج تک یہ عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ہے (بائبل ڈکشنری مطبوعہ آکسفورڈ پریس) ممکن ہے یہ یا اس کے قریب کوئی مقام ہو یا کسی خاص چٹان پر سونٹا مارنے کی ہدایت کی جہاں سے پانی کا چشمہ بہہ نکلا اور پھر اس کے بارہ چشمے بن گئے۔ کسی پتھر کے شق ہو جانے سے پانی کے چشمے کا نکل آنا بھی ایک معمولی واقعہ ہے۔لیکن بارہ قبیلوں کے ان چشموں پر آباد ہونے کے لیے یہی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ۔مفسرین کے اس قصے کی بنیاد کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ تین گز مربع کا ایک پتھر رہتا تھا جہاں اسے جنگل میں رکھ کر سونٹا مارتے اس سے بارہ چشمے نکل پڑتے۔قرآن وحدیث پر نہیں ہے۔جو معنی ہم نے کیے ہیں وہ اس لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہیں کہ اگلی آیت

تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ

چیزوں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اس کی ترکاریوں اور اس کی ککڑیوں سے اور اس کے لہسن سے اور اس کے مسور سے اور اس کے پیاز سے (89) اس نے کہا کیا تم وہ چیز جو ادنٰی ہے اس کے بدلہ میں لینا چاہتے ہو جو بہتر ہے؟ (کسی) شہر میں اتر پڑو جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ (90) اور ان پر

---

میں جب کھانا مانگنے کا ذکر آتا ہے تو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ شہر میں اتر پڑو اور کھیتی باڑی کرو اور دونوں واقعوں کا یکجا بیان بتاتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔

89- ﴿بَقْلِهَا﴾ بَقْلٌ کے معنی ہیں ظاہر ہوا۔ ہر ایک چیز جس سے زمین سرسبز ہو بقل ہے مگر یہاں مراد وہ اعلیٰ درجہ کی ترکاریاں ہیں جو انسان کھاتا ہے۔

﴿فُوْمِهَا﴾ فُوْمٌ کے معنی لہسن بھی آتے ہیں اور گیہوں بھی۔ یہاں مراد لہسن ہی معلوم ہوتی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ثُوْمٌ ہے اور قرینہ بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔

**بلا محنت مانگنے کی عادت، بنی اسرائیل اور مسلمان:**

بنی اسرائیل کے سارے واقعات میں یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ ہر چیز بلا محنت مانگتے ہیں۔ اسی لیے جنگ کا حکم ہوا تو وہاں بھی کام سے دل چرایا ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المآئدۃ: 24:5] ”تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔“ چاہتے تھے کہ فتح ہوا ہوا یا ملک مفت مل جائے۔ یہی حالت آج مسلمانوں کی ہے۔ محنت سے دل چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بادشاہت کے مالک ہوں یا امام مہدی علیہ السلام آئیں اور وہی سب کچھ کر کے دے جائیں اور مسلمانوں کو خزانوں کے مالک بنادیں۔ اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہود کو دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرو تو یہ چیزیں ملیں گی اور ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ میں یہی ہدایت ہے، دیکھو اگلا نوٹ۔

90- ﴿اَدْنٰی﴾ اَدْنٰی۔ دَنُوٌّ سے ہے جس کے اصل معنی قرب ہیں۔ اَدْنٰی سے مراد بعض وقت اصغر یعنی چھوٹی چیز بمقابلہ بڑی کے اور بعض وقت ارذل یعنی زیادہ حقیر بمقابلہ بہتر کے اور بعض وقت اقرب یعنی زیادہ قریب بمقابلہ دور کے ہوتی ہے۔ (غ) یہاں خیر کا مقابلہ ہے اس لیے ارذل مراد ہے۔

﴿مِصْرًا﴾ مصر کے اصل معنی حد ہیں اس لیے ہر ایک ممصور یعنی محدود شہر کو مصر کہتے ہیں اور مصر مشہور ملک کا نام بھی ہے۔ مگر یہاں نکرہ ہے اور مراد شہر ہے۔

الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع 7 2 7

ذلت اور محتاجی ڈالی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آ گئے یہ اس لیے (ہوا) کہ وہ اللہ کی باتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لیے (ہوا) کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔(91)

---

**زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ:**

ادنیٰ اور خیر سے مراد یہاں ادنیٰ اور بہتر حالت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سبزیاں ترکاریاں چاہتے ہیں اور وہ بغیر کاشتکاری اختیار کرنے کے پیدا نہیں ہوسکتیں جو قوم زراعت میں لگ جائے وہ فاتح نہیں بن سکتی۔ اس لیے ان کو سمجھایا کہ گو تم کو کھانے کی مشکلات ہیں۔ مگر یہ حالت انجام کار تمہارے لیے زیادہ مفید ہے۔ زراعت میں لگ جاؤ گے تو فتوحات تمہیں میسر نہیں آسکتیں۔ پھر اس کی طرز بھی بتادی کہ شہری زندگی اختیار کرلو اور کھیتی باڑی کرو۔ یہ چیزیں مل جائیں گی۔ ان کی خواہشات کا میلان اس قسم کے کاموں کی طرف اس لیے بھی زیادہ تھا کہ مصر میں وہ ایسے ہی کام زیادہ تر کرتے تھے۔ مصر کے معنی شہر ہیں اور یہاں ملک مصر ہرگز مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک شہر کی صورت میں رہائش اختیار کرلو۔

91- ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ﴾ یہ محاورہ [ضَرَبَ الْخَيْمَةَ] سے لیا گیا ہے۔ یعنی اس سے خیمہ لگایا۔ مراد یہ ہے کہ ذلت نے ان کو اس طرح اپنے اندر لپیٹ لیا جیسے خیمہ اس شخص کو جس پر وہ لگایا جاتا ہے۔

﴿الذِّلَّةُ﴾ ذِلٌّ اور ذِلَّةٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مقہور یا محکوم ہونے کی حالت اور ذِلٌّ وہ ہے جو صعوبت کے بعد ہو۔ (غ) مگر ذِلَّةٌ ایسی محکومی کی حالت ہے جس کے ساتھ قتل و غارت بھی لگی ہو جیسا کہ [آل عمران: 111:3] میں مفسرین نے لکھا ہے کیونکہ یہ محکومیت کی ذلیل ترین حالت ہے۔

﴿الْمَسْكَنَةُ﴾ سَكَنٌ سے ہے جو حرکت کے بعد ٹھہر جانے کا نام ہے۔ (غ) اور سکن کے معنی زوال رعب بھی ہیں۔ (غ) اور اس کے معنی میں جھکنا اور ذلت اور حال بد داخل ہیں اور کبھی مَسْكَنَةٌ سے مراد ضعف یعنی کمزوری ہوتی ہے۔ (ن) گویا مسکنت کی حالت وہ ہے کہ پھر حکمران ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں۔ پس یہ محکومیت کا دوام ہے۔

﴿بَآءُوْ﴾ بَوَاءٌ اصل میں مکان کے اجزا میں مساوات یعنی ہمواری کو کہتے ہیں اور ﴿بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کے معنی ہیں ایسے مکان میں اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا۔ (غ) اسی لیے ﴿يَتَبَوَّاُ﴾ جگہ بنانے کے معنی میں ہے یا بَآءَ کے معنی احْتَمَلَ ہیں گویا وہ اس گناہ یا غضب کی جگہ بن گیا۔ (ت) اور بَآءَ کے معنی رَجَعَ بھی آئے ہیں یعنی لوٹ آیا۔

﴿يَقْتُلُوْنَ﴾ قَتَلَ کے معنی نمبر 77 میں بیان ہو چکے ہیں۔ روح المعانی میں آیت 87 میں ﴿فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ ''انبیاء کے ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہو۔'' کی تفسیر میں قتل کے معنی یوں کیے ہیں: [وَالْمُرَادُ مِنَ الْقَتْلِ مُبَاشِرُ الْأَسْبَابِ الْمُوْجِبَةِ

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور اچھے کام کرتا ہے تو ان کے لیے ان کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ

---

لِزَوَالِ الْحَيٰوةِ سَوَآءً مُرَتَّبٌ عَلَيْهِ اَوْ لَا] یعنی قتل سے مراد ان اسباب کا حصول ہے جن سے حیات زائل ہوسکتی ہے خواہ اس پر زوال حیات مرتب ہو یا نہ۔

### قتل بمعنی اشراف علی القتل:

اور یہ فی الواقع سچ ہے کہ ایک فعل کے اشراف پر عام طور پر وہ لفظ بول دیا جاتا ہے جو اصل فعل پر دلالت کرتا ہے خود قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے: ﴿فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ آیت[نمبر: 231] میں بَلَغَ سے مراد واقعی پہنچ جانا نہیں بلکہ پہنچنے کے قریب ہوجانا ہے پس ﴿يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ﴾ میں یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ نبیوں کے قتل کے درپے ہوتے تھے اور یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ نبیوں کو قتل کردیتے تھے۔

﴿النَّبِيّٖنَ﴾ نَبِيٌّ کی جمع ہے جو نَبَأٌ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر ہیں یا وہ خبر جو اپنے اندر عظیم الشان فائدہ رکھتی ہو اور نبی فعیل بمعنی فاعل ہے مگر ہمزہ ترک کردیا گیا اس لیے نَبِیْءُ اللهِ صحیح نہیں نَبِيُّ اللهِ ہے جیسا حدیث میں مذکور ہے اور بعض کے نزدیک نَبِيٌّ نَبُوَّةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت یعنی بلندی ہیں اور نبی کو اس کے مقام بلند کے لحاظ سے نبی کہا گیا۔ (غ) اور نبوت سفارت ہے (یعنی پیغام رسانی) اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذوی العقول کے درمیان۔ (غ) اور قاموس میں ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینے والے کو کہتے ہیں جس کی مزید تشریح تاج العروس میں یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اس کو غیب کی باتیں بتاتا ہے اور اسے علم دیتا ہے کہ وہ اس کا نبی ہے۔

### نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت:

پس لفظ نبی کے لغوی معنی صرف خبر دینے والے کے ہیں۔ مگر اصطلاح شرعی میں یہ لفظ صرف ان رفیع القدر انسانوں پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کو انسانوں تک پہنچاتے اور ان کو ان پر چلنے کی راہ بتاتے ہیں۔ لغوی معنی کی رو سے ہر ایک خواب بین یا الہام پانے والے پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

### نبی کے لیے کتاب ضروری ہے:

مگر چونکہ شریعت نے خاص اصطلاح قرار دی ہے۔ پس جو شخص سفارت کے کام پر مبعوث نہ ہو گو وہ کتنے بھی الہام پائے یا رؤیا دیکھے وہ نبی نہیں کہلاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ نبی کریم ﷺ کثرت سے سچے خواب دیکھتے تھے مگر جب تک اِقْرَاْ کا حکم نہیں پہنچا اس وقت تک اپنے آپ کو نبی نہیں سمجھا اور وہ احکام الٰہی جو نبی پہنچانے کے لیے مامور ہوتا ہے وہی اس کی کتاب ہے۔ اس لیے آیت[نمبر: 213] میں فرمایا کہ نبی کو جو خدا مبعوث کرتا ہے تو وہ بشارت بھی دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کتاب بھی نازل کرتا ہے ﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ﴾[البقرۃ: 213:2] تاکہ اس کتاب کے ساتھ وہ ان کے اختلافوں کا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ غمگین ہوں گے۔ (92)

فیصلہ کرے۔ پس نبی بغیر کتاب کے نہیں ہوسکتا۔

**آنحضرت ﷺ کے بعد نبی نہیں:**

اور چونکہ قرآن کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں اس لیے آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔

**بنی اسرائیل کی ذلت ومسکنت:**

یہاں جونقشہ ذلت اور مسکنت کے بنی اسرائیل کے لازم حال ہونے کا کھینچا ہے اس کا تعلق پہلے مضمون سے صرف اسی قدر ہے کہ ان کی کجروی کا آخری نتیجہ یہ ہوا ورنہ یہ مرادنہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہی ایسا ہوگیا تھا۔ بلکہ یہ ایک زمانہ دراز کے بعد کا آخری نقشہ ہے اوراس کی وجہ بھی پیچھے نہیں بلکہ اگلے الفاظ میں بیان کی ہے اس لیے کہ انہوں نے آیات اللہ کا انکار کیا اور نبیوں کو ناحق مارتے تھے۔خدا کی نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے۔

**قتل انبیاء سے مراد قتل کی کوشش یا ابطال دعوت بھی ہوسکتی ہے:**

نبیوں کے قتل سے کیا مراد؟ بائبل کے بعض حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فی الواقع بھی بعض نبیوں کو قتل کیا۔مگر قتل کے معنی ابطال دعوت بھی آتے ہیں یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دینا۔ چنانچہ اس روایت کے: [إِذَا بُوِيعَ لِخَلِيْفَتَيْنِ فَاقْتُلُوْا الْآخِرَ مِنْهُمَا] (صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ: 4905) کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں: [أَيْ أَبْطِلُوْا دَعْوَتَهُ وَاجْعَلُوْهُ كَمَنْ مَاتَ] یعنی اس کی دعوت کو باطل کردو۔اوراسے ایسا سمجھ لوجیسے کہ وہ شخص جو مر چکا۔ایسا ہی قتل کا لفظ زبان عربی میں ان اسباب کے جمع ہوجانے پر بھی بولا جاتا ہے جن سے موت واقع ہوسکتی ہے۔خواہ واقع ہو یا نہ ہو۔پس ان دونوں معنی کے لحاظ سے بھی الفاظ قرآنی کی تفسیر ہوسکتی ہے یعنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو باطل کرنا یا ان کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ روح المعانی میں ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کی حالت ایسی ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہوتو قتل ہی کر دیں۔

[زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو نمبر: 77, 91]

92- ﴿هَادُوْا﴾ هُوْدٌ کے اصل معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا ہیں۔(غ) اور ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ [الأعراف: 156:7] میں هُدْنَا کے معنی تُبْنَا ہیں یعنی ہم نے توبہ کی اور هَادَ فُلَانٌ کے معنی ہیں فلاں شخص نے دین میں یہود کا طریقہ اختیار کیا۔

﴿النَّصٰرٰى﴾ نَصْرَانِیٌّ کی جمع ہے اور یہ نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گاؤں ناصرہ سے مشتق ہے۔بعض نے اس کو عربی مادہ نصر سے ملانے کی کوشش کی ہے۔مگر یہ تاویل بعید ہے۔

﴿الصّٰبِئِيْنَ﴾ صَابِئٌ کی جمع ہے جو صَبَأَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں چلا گیا۔(ت) اور اس کے اصل معنی ہیں ظاہر ہوا۔(غ) اسی وجہ سے کفار آنحضرت ﷺ کو صابی کہتے تھے۔ صابی کون لوگ ہیں؟ اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔بعض کے نزدیک وہ ملائکہ کی عبادت کرتے تھے،بعض کے نزدیک ستاروں کی،بعض کہتے ہیں وہ دین

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند

نوح علیہ السلام پر تھے، بعض کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کے بین بین ایک فرقہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا میں ہے کہ یہ ایک نیم عیسائی فرقہ تھا جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے مریدوں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ رائے آخری خیال کے ساتھ ملتی ہے اور یہود و نصاریٰ کے ذکر کے ساتھ قرین قیاس ہے۔

## ایمان باللہ والیوم الآخر:

ایمان باللہ والیوم الآخر کو قرآن کریم نے مسلمان ہونے کے مرادف رکھا ہے [دیکھو نوٹ: 20]۔ سورہ مجادلہ کے آخر میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والی قوم اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھ سکتی۔ فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ [المجادلة: 22:58] یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کی تائید کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ کامل مومنین کی جماعت ہے۔ پھر ان کے متعلق فرمایا: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ [المجادلة: 22:58] ''اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔'' یہ بھی کامل مومنین کے لیے ہی ہے۔

## وسعت دائرۂ اسلام:

پچھلے رکوع کے خاتمہ پر یہ بتایا تھا کہ نافرمانیوں کی وجہ سے ذلت اور مسکینی یہود کے اوپر لازم کر دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے نیچے آ گئے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ رحمت الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کسی قوم پر بند نہیں ہوتا۔ اعمال کی سزا ہوتی ہے اور یہود اب بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں اور قوموں میں ممتاز ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اسلام لائیں۔ اصل غرض تو یہودیوں کو رحمت کی راہ بتانے کی ہے مگر اس کو عام اصول کے رنگ میں بیان کیا۔ اس لیے کہ یہود سمجھتے تھے کہ قوم یہود ہی کو نجات مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری قومیں سب کی سب محروم کی گئی ہیں۔ پس یہاں یہ اصول بیان کر دیا کہ کوئی قوم بحیثیت قوم نہ نجات کی ٹھیکیدار ہے نہ نجات سے محروم ہے۔ اسلام کا دائرہ وسیع ہے ہر ایک قوم اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ شرط ہیں ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد منہ سے دعویٰ ایمان کرنے والے ہیں اور ان کو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ رکھ کر یہ بتا دیا کہ نرے دعویٰ ایمان سے چنداں فائدہ نہیں۔

## کامل نجات صرف اسلام میں ہے:

اسلام اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب میں بھی صداقت ہے۔ ہاں اس صداقت میں باطل کی آمیزش ہو گئی ہے مگر وہ صداقت اپنے کمال میں صرف اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ کی حالت جو اس دنیا میں ہی انسان کو بہشتی بنا دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کامل قرب عطا فرماتی ہے، صرف اسلام سے ہی مخصوص ہے۔ ان الفاظ سے یہ مطلب نکالنا کہ عیسائی رہ کر اور تثلیث اور کفارہ پر ایمان رکھ کر بھی انسان نجات پا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی تمام تعلیم کے خلاف ہے ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران: 19:3] ''دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔'' ﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ

الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۶۳

کیا، جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو اور جو اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی بنو۔(93)

---

الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾[آل عمران: 85:3] ''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔'' اور بیسیوں آیات نجات کامل کے لیے آنحضرت ﷺ پر ایمان کو ضروری ٹھہراتی ہیں۔ بدوں وساطت خاتم النبیین ﷺ اب کوئی شخص خدا کے قرب کو حاصل نہیں کرسکتا۔ گو ایک حد تک گناہ سے پاک ہو جاتا ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ ایمان باللہ سے مراد توحید الٰہی پر ایمان لانا ہے تو اول تو یہ یہاں لکھا نہیں کسی دوسری جگہ سے یہ قید نکالی جائے گی۔ دوسری جگہ سے ہی قید لگانا ہے تو پھر وہی قید کیوں نہ لگائیں جو خود قرآن شریف نے لگائی ہے کہ ایمان باللہ والیوم الآخر سے مراد مسلمان ہونا ہے اور دوسرے پھر بھی نرے اعمال صالحہ تو کافی نہ ہوئے۔ کروڑہا کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو یا تین خدا مانتے ہیں یا بت پرستی کے ساتھ خدا مانتے ہیں یا بدھ مذہب کے پیروؤں کی طرح خدا کے منکر ہیں یا دہریہ ہیں۔ پس ایمان باللہ سے مراد صرف توحید الٰہی لینے سے حاصل بھی کچھ نہ ہوا اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی بھی مخالفت لازم آئی۔ جہاں سچا دین اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ صرف اسلام کو قرار دیا ہے۔

93- ﴿اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ اَخْذِ مِیْثَاق یا عہد لینے سے مراد بذریعہ نبی کے بعض احکام کا دیا جانا ہے۔ نبی علیہ السلام پر ایمان لانا یہ اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں گے۔

﴿رَفَعْنَا﴾ رَفَع کا استعمال امام راغب نے چار طرح پر بیان کیا ہے؛ ① اجسام کے متعلق جب ان کو اپنی جگہ سے اوپر اٹھایا جائے۔ ② عمارت کے متعلق جب اسے اونچا کیا جائے جیسے: ﴿وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ﴾[البقرة: 127:2] ''اور جب ابراہیم بنیادیں اٹھاتا تھا۔'' ③ ذکر کے متعلق جب اسے شہرت دی جائے۔ ④ مرتبہ کے متعلق جب اسے شرف دیا جائے ﴿رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ کے معنی یہ نہیں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر اونچا کیا۔ بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ بخاری [كِتَابُ المَنَاقِبْ] میں آتا ہے: [فَرُفِعَتْ لَنَا صَخْرَةٌ] (صحيح البخاري، باب عَلاَمَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الإِسْلاَمِ: 3615) جس کے معنی بحار الانوار میں یہ لئے ہیں: [ظَهَرَتْ لِأَبْصَارِنَا] یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے چٹان ظاہر ہوئی۔ حالانکہ عام معنی کی رو سے یوں کہنا چاہیے تھا کہ ہمارے لیے صخرہ اونچا کیا گیا۔ مگر فی الحقیقت صخرہ اونچا نہیں ہوا بلکہ اس کی اونچائی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

﴿الطُّوْرَ﴾ پہاڑ کو کہتے ہیں۔(ت) ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ہے۔

### طور پہاڑ اٹھانے سے مراد:

اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو لاکر معلق کر دیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کو نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر آپڑے گا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾[البقرة: 256:2] جب انسان کو حکم

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

پھر اس کے بعد تم پھر گئے سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۚ﴿۶۵﴾

اور بے شک تم ان کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد سے نکل گئے پس ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ۔(94)

---

ہے کہ دین میں جبر نہ کرے تو خود خدا کا جبر کرنا کیا معنی۔ علاوہ ازیں اس جبر کا تو یہی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا، ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ان کو یاد دلایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھو یعنی اس پر عمل کرو۔ توریت میں یہ الفاظ ہیں: ''اور موسی لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملا دے اور وَے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے۔'' [خروج: 17:19] اور ان کو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ اوپر نہ آئیں۔ [خروج: 24:19]

94- ﴿اعْتَدَوْا﴾ عَدَا سے ہے اور عَدْوٌ کے معنی تجاوز یعنی حد سے نکل جانا ہیں۔ اور اِعْتَدَاء حق سے تجاوز کا نام ہے۔

سَبْتٌ کے اصل معنی کاٹنا ہیں۔ (غ) اور اصطلاح میں ایک خاص دن تھا۔ یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ کو کاروبار بند رکھنے کا حکم تھا اس لیے وہ دن کاروبار کے قطع ہونے کی وجہ سے سبت کہلایا۔ اِعْتِدَاءِ فِي الْسَّبْتِ سے مراد سبت کے حکم کو توڑنا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن ان کی عبادت کے لیے مقرر تھا۔ جب اس دن بھی خدا کی طرف دھیان نہ لگایا اور اپنی دنیا میں ہی مبتلا رہے تو اخلاق فاضلہ سے آہستہ آہستہ عاری ہوتے چلے گئے۔

﴿قِرَدَةً﴾ قِرَدٌ کی جمع ہے بندر۔

﴿خٰسِـِٕيْنَ﴾ خَسَاءٌ سے ہے جس کے معنی ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جانا ہیں۔ (غ) دوزخیوں کے متعلق آتا ہے: ﴿قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا﴾ [المؤمنون: 108:23] ''کہے گا اسی میں ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اور سورہ ملک میں ہے: ﴿يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا﴾ [الملك: 4:67] ''نظر تیری طرف تھک کر واپس آئے گی۔'' جہاں مُتَحَيِّرًا معنی لیے گئے ہیں۔

## بنی اسرائیل کا بندر بننا:

﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے: [قَالَ: مُسِخَتْ قُلُوْبُهُمْ وَلَمْ يُمَسَّخُوْا قِرَدَةً]

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پس ہم نے اسے عبرت بنایا ان کے لیے جو ان کے سامنے تھے اور جو ان کے بعد میں آنے والے ہیں اور متقیوں کے لیے نصیحت۔ (95)

---

(تفسیر المنال: جلد6، صفحہ 371) یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔ مفردات میں بھی منقول ہے: [قِيْلَ: بَلْ جُعِلَ أَخْلَاقُهُمْ كَأَخْلَاقِهَا] (المفردات: 401) یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔ [النسآء: 47:4] میں ہے: ﴿اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ﴾ یعنی ''ہم ان پر لعنت کریں جیسا سبت والوں پر لعنت کی۔'' اب رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب السبت پر ہوئی۔ لیکن اول الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کیے گئے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا: ﴿جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [المآئدۃ: 60:5] یعنی ان میں سے بندر اور سور بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پرستش کی یہ لوگ بہت بری حالت میں ہیں اور سیدھے رستے سے بہت دور بھٹکے ہوئے۔ اب جو لوگ بندر اور سور بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور وہ سیدھی راہ سے دور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔ اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے۔ کسی کو گدھے سے مثال دی ہے: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ [الجمعۃ: 5:62] کسی کو کتے سے: ﴿كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ [الاعراف: 176:7] بندر ایک نقال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی۔ پس ان کو بندر کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقالی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں۔ یا ذلت کے لحاظ سے ان کو بندر کہا ہے اور اس کی طرف ﴿خٰسِئِيْنَ﴾ میں اشارہ ہے۔ عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لیے دی جاتی ہے: [أَزْنىٰ مِنْ قِرَدٍ] اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائبل گواہ ہے:

''تیرے بیچ وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا۔۔۔۔ کسی نے دوسرے کی جورو سے برا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے۔'' [حزقیل: 22:9-11]

ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے۔

95- ﴿نَكَالًا﴾ نَکَال عبرتناک سزا کو کہا جاتا ہے کیونکہ نَکَلَ کے معنی قید کرنے کے ہیں۔ (غ) اور نَکَال سے مراد وہ سزا ہے جو دوسرے کو ایسا کام کرنے سے روک دے۔ (غ) ﴿مَا بَيْنَ يَدَيْهَا﴾ سے مراد اس زمانہ کے لوگ اور ﴿مَا خَلْفَهَا﴾ سے پیچھے آنے والی نسلیں ہیں۔

﴿مَوْعِظَةً﴾ وَعْظ ایسا روکنا ہے جس کے ساتھ تخویف ہو۔ یعنی برے کام سے اس کا بدانجام بتا کر روکنا یا وہ اچھی باتوں کا یاد

| | |
|---|---|
| وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ | اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو، انہوں نے کہا کیا آپ ہم سے ہنسی کرتے ہیں؟ (موسیٰ نے) کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہوجاؤں۔ (96) |

دلانا ہے جس سے قلب میں رقت پیدا ہو۔ (غ) مَوْعِظَةٌ اسی سے اسم ہے۔

96- ﴿بَقَرَةً﴾ اس کی جمع بَقَرٌ ہے اور بَقَرَةٌ گائے کو اور ثَوْر بیل کو کہتے ہیں اور بَقَرٌ کے معنی شق یعنی پھاڑنا آتے ہیں۔ اس لیے باقر خطاب ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے کہ وہ علوم کے دقائق کے پھاڑنے میں وسعت رکھتا ہے۔

﴿هُزُوًا﴾ ایسی مزاح کو کہتے ہیں جو خفیہ طور پر کی جائے۔

﴿الْجٰهِلِيْنَ﴾ امام راغب نے جَهْلٌ کی تین قسمیں بیان کی ہیں؛

① اول نفس کا علم سے خالی ہونا یعنی ایک چیز کا علم نہ ہونا ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ﴾ [البقرة: 2:273] میں جاہل سے مراد وہ شخص ہے جو حالات سے ناواقف ہے۔

② دوسرے ایک چیز پر خلاف اس کے اعتقاد رکھنا جس حالت میں وہ ہو۔

③ تیسرے ایک کام کرنا خلاف اس کے جو اس کا حق ہے کہ اس طرح کیا جائے۔

یہاں یہی تیسرے معنی مراد ہیں۔

## گائے ذبح کرنے کا حکم:

گائے کی پرستش ایک خاص قسم کا شرک تھا جو بنی اسرائیل میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کا علاج ضروری تھا۔ موسوی شریعت میں اس قسم کی گائیوں کی قربانی کرنے کا حکم خاص خاص موقعوں پر تھا جو ہل میں نہ لگائی جاتی تھیں۔ دیکھو [استثنآء: 21:1-9] ''ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو۔'' اس قسم کی گائے کو قتل کا پتہ لگانے کے لیے ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اور [گنتی: 19:1-19] میں ایک لال گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہے: ''جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو۔'' یہ عام احکام بتاتے ہیں کہ گائے کی پرستش کے شرک کو دور کرنا بھی ان کا مقصود تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں آیا انہی عام احکام کی طرف اشارہ ہے یا یہ کسی خاص واقعہ کا ذکر ہے؟ میں دوسری توجیہہ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آیت کے آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک خاص گائے کے ذبح کرنے کا حکم تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی خاص خوبصورت گائے کی عظمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بچھڑے کی پرستش کی طرح اس کی پرستش کا خطرہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے نہ بچہ، جوان ہے ان کے بین بین، پس کرو جو کچھ تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ (96ا)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾

انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے اس کا رنگ گہرا زرد ہے دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔ (96ب)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ کیسی ہے؟ کیونکہ ہمارے لیے گائیں ایک سی ہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور پتہ لگا لیں گے۔

---

96-ا ﴿مَا هِيَ﴾ سوال اس کی حالت اور صفت سے ہے یعنی وہ کیسی ہے۔

﴿فَارِضٌ﴾ فَرَضٌ سے ہے جس کے معنی سخت چیز کا کاٹنا ہیں اور احکام میں وہ حکم فرض ہے جس کے متعلق حکم قطع ہو چکا اور فَارِضٌ اس بوڑھی گائے کو کہتے ہیں جس کی ولادت بوجہ بڑھاپے کے منقطع ہو چکی ہو۔ (غ)

﴿بِكْرٌ﴾ بُكْرَةٌ۔ اَوَّلُ النَّهَارِ یعنی دن کے پہلے حصہ کو کہتے ہیں اور پہلے بچہ کو بِكْرٌ کہتے ہیں اور یہاں بِكْرٌ سے مراد وہ ہے جس نے ابھی بچہ نہیں جنا۔ (غ)

﴿عَوَانٌ﴾ عَوْنٌ کے معنی مدد ہیں اور عوان حیوانات میں اس کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے نصف حصہ کو پہنچ چکا ہو۔ نہ بہت چھوٹا نہ بہت بڑا۔ (ت)

96-ب ﴿فَاقِعٌ﴾ گہرے زرد رنگ کو اَصْفَر فَاقِع یا صَفْرَاء فَاقِع کہتے ہیں۔ گویا زردی کی گہرائی پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ ایسا ہی گہرے سیاہ کو اَسْوَد حَالِكٌ کہتے ہیں۔ گہرے سرخ کو اَحْمَرُ قَانٌ، گہرے سفید رنگ کو اَبْيَضُ نَاصِعٌ، گہرے سبز کو اَخْضَر نَاضِرٌ۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع 8/10/8

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو کام میں نہیں لگائی گئی کہ زمین کو پھاڑتی ہو اور نہ کھیت کو پانی دیتی ہے صحیح و سالم ہے اس میں کوئی داغ نہیں، انہوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک (پتہ) بتایا ہے، سو انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ (97)

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ۚ

اور جب تم نے ایک شخص کو (اپنی طرف سے) قتل کر دیا پھر آپس میں اختلاف کیا اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپاتے تھے۔ (98)

---

97- ﴿ذَلُوْلٌ﴾ ذَلّ یعنی مقہور ہونے سے ہے اور اس جانور کو کہتے ہیں جو کام میں لگایا گیا ہو اور اس کی سختی توڑ دی گئی ہو۔ یعنی اسے ماتحت کر لیا گیا ہو۔

﴿تُثِيْرُ﴾ ثَارَ غبار یا بادل کے پھیل جانے پر بولا جاتا ہے اور اَثَارَ کے معنی ہیں اس میں ہیجان پیدا کیا ﴿وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ﴾ [الروم: 9:30] ''اور انہوں نے زمین کو کاشت کیا'' اور اِثَارَةٌ زراعت کے لیے زمین کے اوپر نیچے کرنے کو کہتے ہیں۔ (غ)

﴿شِيَةَ﴾ اس کا اصل وَشِيَةٌ ہے اور وَشْی کے معنی ہیں ایک چیز پر ایسا داغ کرنا جو اس کے کھلے رنگ کا مخالف ہو۔

﴿كَادُوْا﴾ كَادُ افعال مقاربہ سے ہے۔ ایک قول کے رو سے اس کی نفی اثبات ہوتی ہے اور اس کا اثبات نفی، گویا كَادُ يَفْعَلُ کے معنی ہیں گو کرنے کے قریب تھا مگر کیا نہیں اور مَا كَادُ يَفْعَلُ کے معنی ہیں گو قریب تھا کہ نہ کیا ہوتا مگر کر لیا۔ (غ) مگر كَادَ کے معنی بعض وقت اَرَادَ بھی آتے ہیں یعنی اس نے ارادہ کیا۔ اور اس کی مثال دی ہے: ﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ﴾ [یوسف: 76:12] اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے ارادہ کیا۔ یا فرمایا: ﴿اَكَادُ اُخْفِيْهَا﴾ [طٰہٰ: 15:20] جس کے معنی ہیں میں ارادہ کرتا ہوں کہ اسے ظاہر کر دوں اور اشعار عرب میں ہے: [كَادَتْ وَكِدْتُ وَتِلْكَ خَيْرُ إِرَادَةٍ] جہاں كَادَتْ کے معنی ہیں اس نے ارادہ کیا اور كِدْتُ کے معنی ہیں میں نے ارادہ کیا۔ (ت)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص گائے تھی اور چونکہ قوم کے دل میں اس کی محبت اور عظمت تھی اس لیے ذبح نہ کرنا چاہتے تھے۔ بار بار کی ہیرا پھیری کا مطلب بھی یہی تھا کہ کسی طرح یہ حکم ٹل جائے۔ بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ یہ کوئی معمولی گائے نہ تھی بلکہ آسمان سے اتری تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ [الزمر: 6:39] سب چار پائے خدا نے ہی اتارے ہیں سو جس طرح دوسرے چار پائے اترے اسی طرح یہ گائے اتری یعنی اسی زمین پر پیدا ہوئی۔

98- ﴿قَتَلْتُمْ﴾ جیسا کہ ﴿يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ﴾ کی تفسیر میں مانا گیا ہے۔ قَتَلْتُمْ کے معنی یا تو یہاں یہ ہیں کہ تم نے ان تمام اسباب کو

وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ اور بے شک ان میں سے ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں تو ان

جمع کر دیا جو زندگی کے منقطع کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں اور یا یہ کہ تم نے اپنے طرف سے قتل کر دیا۔ گو کوئی اور مانع ہو گیا ہو۔ [دیکھو نمبر: 91]

﴿فَادّٰرَءْتُمْ﴾ دَرْءٌ سے ہے تَفَاعَلْتُمْ کے وزن پر۔ پس اس کا اصل تَدَارَأْتُمْ ہے۔ (ج) اور دَرْءٌ کے معنی نُشُوْزٌ یعنی جھگڑا کرنا اور اختلاف ہیں۔ (ت) خلع کی حدیث میں ہے: [إِذَا كَانَ الدَّرْءُ مِنْ قِبَلِهَا] جہاں درع کے معنی خلاف اور نشوز ہیں اس لیے اِدّٰرَءْتُمْ کے معنی [اِخْتَلَفْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ] کیے گئے ہیں یعنی تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا۔ (ج۔ر) اور دَرْءٌ کے معنی دفع بھی آتے ہیں جس کی مثال دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے: ﴿وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ﴾ [النور: 8:24] ''اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے'' ﴿فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ [آل عمران: 168:3] ''تو اپنی جانوں سے ہٹا رکھو''۔ (غ)

## گائے کے ذبح کے مقابل پر ایک اور واقعہ:

[استثناء: 21:1-9] میں جو عام حکم ہے کہ جب مقتول کا پتہ نہ لگے تو ایک ایسی بچھیا کو لے جو جوئے تلے نہ آئی ہو اسے ذبح کیا جائے اور اس پر ہاتھ دھوئے جائیں۔ ممکن ہے کہ ان آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ مگر بظاہر جس طرح سارے واقعات جن کا ذکر پچھلے رکوعوں میں وَاِذْ کے ساتھ شروع ہوتا ہے الگ الگ واقعات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی الگ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق گائے کے ذبح کے واقعہ سے کچھ نہیں بلکہ اس کے مقابلہ پر ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے اور قرآن کریم میں اضداد کا ذکر بہت آتا ہے۔ اس لیے جب پہلے رکوع کو اس آیت پر ختم کیا کہ ایک گائے کے ذبح کرنے میں تم نے کس قدر پس و پیش سے کام لیا تو اب یہ بتاتا ہے کہ اس کے مقابل پر تم اس حالت پر غور کرو جب تم نے ایک عظیم الشان انسان کو قتل کر دیا۔

## ﴿قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے:

مفسرین کہتے ہیں ایک بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تا کہ اس کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی جائداد کا وارث ہو۔ مگر اس قسم کے قتل کے واقعات تو قوموں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہو تو قرآن کریم کو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرائن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اول تو جو دو جرم ان کے بیان کیے تھے ایک کفر آیات اللہ اور دوسرا قتل انبیاء۔ ان میں سے اول کی مثالیں کئی ایک بیان کر دیں مگر دوسرے کی مثال کوئی بیان نہ کی تھی۔ دوسرے نَفْسًا میں تنکیر عظمت کے لیے ہے۔ کسی عظیم الشان انسان کا ذکر ہو سکتا ہے۔ تیسرے تمام قوم ایک معمولی انسان کے قتل پر ملزم نہیں ہو سکتی۔ ہاں انبیاء کے قتل پر کل قوم کو ملزم کیا جاتا ہے۔ اگر بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تو قوم پر الزام بے معنی ہے لیکن اگر کوئی نبی قتل ہو تو قوم پر الزام درست ہے۔ کیونکہ خود قرآن کریم نے قوموں کو انبیاء کے قتل کے لیے ملزم کیا ہے۔ پس یہ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے۔

الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ میں سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان میں ایسے بھی ہیں

یہ نبی حضرت مسیح ہیں:

اب اس کے متعلق چند اور باتیں قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اپنی طرف سے قتل کر دینے کے بعد پھر ان لوگوں میں اختلاف ہوا ہے جیسا: ﴿فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا﴾ سے ظاہر ہے۔ دوسرے وہ قتل میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ فرمایا کہ جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کرنا تھا۔ اب ایسا قتل یا قتل کی کوشش جس میں اختلاف ہوا ہو اور پھر وہ قتل بھی کسی نبی کا ہو۔ حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھانے کا واقعہ ہے اور کوئی واقعہ اس قسم کا تاریخ بنی اسرائیل میں نہیں پایا جاتا۔

## مسیح کے قتل کی کوشش:

قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف فرمایا: ﴿وَّ قَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ﴾ [النسآء: 157:4] یعنی وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا۔ مگر فرمایا: ﴿وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ﴾ [النسآء: 157:4] انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر مارا بلکہ ان کے لیے وہ مشابہ بالمقتول کر دیا گیا اور پھر فرمایا: ﴿وَ اِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ﴾ [النسآء: 157:4] جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ پس اگر ایک طرف قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے تک کو ذبح کرنے میں اس قدر لیت و لعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے۔ حضرت مسیح کی طرف اشارہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ﴾ پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے اور قرآن شریف سے ہی ثابت ہے: ﴿فَطَالَ عَلَيۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ﴾ [الحدید: 16:57] یعنی ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تھے۔ پس یہ کوئی ایسا قتل ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لمبا زمانہ گزرنے کے بعد وقوع میں آیا۔

## قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے:

قرآن کریم بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ ان واقعات کا جو ذکر یہاں ہے وہی ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے [دیکھو آیت نمبر: 153] جہاں خدا کو دیکھنے کی درخواست ہے۔ پھر بچھڑا بنانے کا ذکر ہے اور [آیت نمبر: 154] میں جہاں میثاق کا ذکر ہے اور شہر میں فرمانبرداری سے داخل ہونے کا حکم ہے اور سبت کے معاملہ میں زیادتی سے روکا ہے اور [آیت نمبر: 155] جہاں نقض میثاق اور قتل انبیاء کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ اس کے مطابق ہے جو یہاں سورہ بقرہ میں بیان ہوا۔ اس قدر فرق ہے کہ یہاں تفصیل ہے۔ سورۃ النساء میں انہی واقعات کا ذکر اختصار سے ہے اور پھر [آیت نمبر: 157] میں حضرت مسیح کے قتل کی کوشش اور اس میں ناکامی اور اختلاف کا ذکر ہے۔ گویا جو کچھ یہاں سورہ بقرۃ میں اشارۃً بیان فرمایا اس کو سورۃ النساء میں کھول کر بیان کر دیا۔ یہ کمال

اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ جو اللہ کے خوف سے گرجاتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔(99)

---

قرآن پاک کا ہے کہ یہ دوسورتیں کئی سال کے فرق پر نازل ہوتی ہیں۔لیکن ایک میں جو اختصار ہے اس کی دوسری میں تشریح کردی ہے اور جس کو پہلے تفصیل سے بیان کردیا تھا اس کا دوسرے موقعہ پر اختصاراً ذکر کردیا۔ یہ مقابلہ بھی اس بات کا مؤید ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوشش کی طرف ہی اشارہ ہے۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ سے کیا مراد ہے؟ اِضْرِبُوْهُ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے۔کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور بَعْضِهَا کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے۔یعنی بعض قتل سے اس کو ماردو یا فعل قتل اس پر پورا وارد نہ ہونے دو۔ چنانچہ ضمیر کا قتل کی طرف جانا جو مصدر فعل سے مفہوم ہے۔بحر المحیط میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

## حضرت مسیح اور واقعات صلیب:

اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا۔صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا۔آپ کے ساتھ جو چور صلیب دیئے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں، آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں۔ یہی ﴿فَاضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ ہے اور ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ کہہ کر بتادیا کہ جس کو تم مردہ خیال کر بیٹھے تھے اسے خدا نے یوں زندہ رکھا یا زندہ کردیا۔اور یہ جو فرمایا ہے:﴿يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ تو بتایا مسیح جو تم کو مردہ معلوم ہوتا تھا جس طرح اسے خدا نے زندہ کردیا۔کیونکہ اللہ کے نام کو بلند کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا۔اسی طرح اگر تم بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام اختیار کرو تو گو تم ایک مردہ قوم ہو اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا فرمائے گا۔

99- ﴿قَسَتْ﴾ حَجَرٌ قَاسٍ سخت پتھر کو کہتے ہیں اس لیے قَسْوَةٌ کے معنی دل کی سختی ہیں۔ اَوْ یہاں بمعنی بَلْ ہے۔

## بنی اسرائیل کی قساوتِ قلبی:

ان کی سخت دلی کو پہلے پتھروں سے مثال دی ہے لیکن بایں امید دلائی ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔ جب پتھروں میں سے بھی نہریں نکل آتی ہیں تو پتھر جیسے سخت دلوں میں سے علوم کی نہریں کیوں نہ بہہ نکلیں جو ایک عالم کو سیراب کردیں۔اس سے نچلے درجہ پر وہ ہیں جن سے پھوٹ کر تھوڑا ہی پانی نکل آتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نفع بہت وسیع نہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا نفع اگر دوسروں تک نہ پہنچے تو اپنی ذات میں ہی فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

## مسلمانوں کی حالت:

بنی اسرائیل کی تاریخ تو سب اسلامی تاریخ کا نقشہ ہے۔ پس بنی اسرائیل سے بڑھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ باوجود قساوت قلبی کے بھی انہیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔جیسا کہ فرمایا:﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتے، پھر اس میں تحریف کرتے بعد اس کے کہ اسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں۔(100)

نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾[الحدید: 16:57] ''کیا ان لوگوں کے لیے جو مومن ہیں وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اترا اس کے لیے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی مثل نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔''اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قساوت قلبی کے بعد علوم سے قوم ترقی کر سکتی ہے۔

100- ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ﴾ طَمَعٌ نفس کا اشتیاق ہے کسی چیز کے لیے اس کو چاہتے ہوئے۔ (غ) اور اس کا اکثر استعمال ذلیل خواہشات پر ہوتا ہے۔ مگر اس کے معنی صرف رِجَا بھی ہیں یعنی کسی چیز کی امید رکھنا۔ (ت)

﴿کَلٰمَ اللّٰهِ﴾ کَلَامٌ کَلَّمَ سے ہے جس کے لیے[دیکھو نمبر: 57] اور کلام ان الفاظ کو کہتے ہیں جو ایک نظم میں ہوں مع اس معنی کے جو ان کے نیچے ہوں۔ (غ) یعنی صرف لفظ بغیر معنی یا معنی بغیر لفظ پر کلام نہیں بولا جاتا۔ پس کلام اللہ الفاظ مع معانی ہیں اور یہ عقیدہ کہ وہ صرف مفہوم ہے جو صاحب وحی کے قلب میں ڈالا جاتا ہے۔ لفظ کلام کے معنی سے غلط ٹھہرتا ہے۔

﴿یُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ تَحْرِیْف حَرَفٌ سے ہے جس کے معنی کنارہ یا حد ہیں اور تَحْرِیْف کے معنی [اَلتَّغَیُّرُ وَالتَّبْدِیْلُ] ہیں۔ (ت) یعنی تغیر و تبدل کرنا۔ تغیر و تبدل لفظی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی۔ مگر اول مراد لفظی ہی لی جائے گی اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے ہوتی ہے جو آگے آتی ہے: ﴿یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ۗ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[البقرۃ: 79:2] اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھ کر کہہ دیتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریف لفظی ہے۔ پس یہاں تحریف لفظی ہی مراد ہے۔

## بائبل میں تحریف لفظی:

قرآن کریم کے اعجازوں میں سے ایک یہ اعجاز ہے کہ بائبل میں تحریف ہونے کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس سے بے خبر تھی اور آج تیرہ سو سال بعد خود عیسائی محققین کو یہ اعتراف ہے کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے۔ ایک امی کو یہ علم تیرہ سو سال پیشتر کس نے دیا جب تحریف کا نام کوئی نہ جانتا تھا؟

## اس بات کا جواب کہ تحریف شدہ کتاب کا نام توریت و انجیل کیوں رکھا؟:

عیسائیوں کو قرآن کریم کے اس بیان پر کچھ اعتراض ہیں۔ اگر یہ کتابیں تحریف شدہ تھیں اصلی نہ تھیں تو ان کا نام وہی کیوں رکھا؟

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا

اور جب ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے ہوتے

---

توریت اور انجیل ان کو کیوں کہا؟ یہ نہایت ہی لغو اعتراض ہے تحریف ہو جانے سے کتاب کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوسرا اعتراض ہے کہ ان پر عمل کے لیے کیوں بلاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یہود و نصاری سے اقل مطالبہ ہے کہ جو کچھ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے جس کو تم خدا کا کلام سمجھتے ہو اسی پر عمل کرو ورنہ تمہارے سارے دعوے نرے لاف و گزاف ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾[المآئدۃ: 68:5] ''کہہ، اے اہل کتاب تم کسی (سچائی) پر نہیں، یہاں تک کہ توریت اور انجیل کو قائم رکھو۔''

## قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہے:

تیسرا اعتراض ہے کہ قرآن کریم ان کا مصدق ہے۔ تصدیق کے معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کی سچائی کی شہادت دیتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اصول کا مصدق ہے۔ اگر ان کے سارے رطب و یابس کا مصدق ہوتا تو خود ان کے غلط خیالات کی تردید کیوں کرتا؟ پھر اعتراض ہے کہ ان کو ہدایت و نور کیوں کہا؟ اس لیے کہ باوجود تحریف کے ان میں ہدایت و نور ہے۔ خود پیشگوئیاں ہدایت و نور ہیں۔ اب جب کہ بائبل میں تحریف ایک مسلم امر ہے۔ یہ اعتراض حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آتا ہے کہ انہوں نے کیوں اس تحریف کو نہ سمجھا؟ وہ بات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے نہیں بتائی وہ رسول اللہ ﷺ کو بتا دی: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾[المآئدۃ: 54:5] ''یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے اس کو دے۔''

## ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی:

اب ہم خود ایک مفسر بائبل کا اقرار دکھاتے ہیں کہ بائبل میں تحریف لفظی ہوئی ہے یہ مفسر پادری ڈملو صاحب ہیں جنہوں نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسیٰ کی کتابیں حضرت موسیٰ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کر کے یہ بنا لی گئیں۔ لکھتے ہیں:

> **کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں:** ''مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسیٰ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں۔ مثلاً یہ اطمینان سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ [استثناء، باب: 34] میں موسیٰ نے اپنی موت کا حال خود نہیں لکھا۔ [استثناء، باب: 1-1] میں یہ بیان کہ یہ وہ باتیں ہیں جو موسیٰ نے یرون کے اس پار بیابان کے میدان میں۔۔۔ اسرائیل کو کہیں۔ کسی ایسے شخص کے نقطہ خیال سے لکھا گیا ہے جو کنعان میں رہتا تھا مگر موسیٰ کنعان میں کبھی نہیں گئے۔''

اس قسم کی بہت سی مثالیں دے کر پادری صاحب کئی وجوہات اس بیان کی تائید میں دیتے ہیں کہ

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

ہیں کہتے ہیں کیا تم ان سے وہ کہہ دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ تمہارے رب کے

''موسیٰ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔''

## اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف:

نئے عہد نامہ یا اناجیل کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ وہی مفسر لکھتا ہے:

''اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر ارمی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گے جن سے وہ خود آشنا تھے۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے وہ اصل میں صرف ان کلیساؤں کے لیے لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے۔ جنہوں نے ان کو پہلے نقل کیا وہ ہرگز ان کو ان معنوں میں پاک نوشتے نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔''

## اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار:

پھر اس سے بھی واضح الفاظ میں وہی مفسر لکھتا ہے:

''پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں وہ احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہد نامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالہ جات کے علاوہ قریباً چار ہزار نئے عہد نامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے۔''

## اناجیل میں تحریف کی مثالیں:

بہت سی مثالیں موجودہ اناجیل سے دی جاسکتی ہیں جہاں صاف طور پر تحریف تسلیم کی گئی ہے اور نئے ترجموں میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے مگر یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ [متی، باب: 17] کی اکیسویں آیت: ''مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا اور روزہ کے نہیں نکالے جاتے۔'' ترمیم شدہ ترجموں میں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے انیسویں باب میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک استاد کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور مسیح جواب میں کہتا ہے: ''تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟'' ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں: ''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے؟'' [متی: 17:19] اس پر پادری ڈملو مفسر مذکور [مرقس: 17:10] کی تفسیر میں لکھتا ہے: ''متی کے مصنف نے یا کسی پہلے کاتب نے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کر دی تاکہ قاری یہ خیال نہ کرے کہ مسیح اپنے نیک ہونے سے انکار کر رہا

| | |
|---|---|
| اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ | حضور تم سے جھگڑ سکیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (101) |
| اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ | بھلا کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ |
| وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ | اور کچھ ان میں سے ان پڑھ ہیں جو کتاب تو جانتے نہیں مگر جھوٹے خیالات کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل پچو خیال دوڑاتے ہیں۔ (102) |

النّصف

ہے۔'' مرقس کے آخری باب کی آیت [20-9] تک کے متعلق اسی مفسر کو یہ اعتراف ہے کہ یہ بعد میں بڑھائی گئیں۔ مرقس کا نسخہ ایک زمانہ کے بعد جب تلاش کیا گیا تو نامکمل ملا۔ اس لیے ضرورت پورا کرنے کے لیے اس قدر آیات بعد میں بڑھادی گئیں۔ غرض تحریف بائبل اب ایک اظہر من الشمس صداقت ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کا یہ اعجاز بھی کہ تیرہ سو سال پیشتر اس وقت تحریف بائبل کی خبر دی جب دنیا میں کسی کو خبر تک نہ تھی کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے۔ نہ کسی یہودی کو یہ علم تھا نہ عیسائی کو۔ مگر آج سب مانتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا نہایت بدیہی ثبوت ہے۔

101- ﴿فَتَحَ﴾ فَتَحَ کے معنی زنجیر اور بیڑی کا دور کرنا ہے۔ جیسے دروازہ کا کھولنا۔ پھر برکات یا علوم کے کھولنے پر بھی کھولا جاتا ہے اور فُتِحَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں ایک چیز کا اسے علم دیا۔ (غ)

﴿لِيُحَآجُّوْكُمْ﴾ حَجٌّ زیارت کے قصد کو کہتے ہیں (اور عرف شریعت میں بیت اللہ کی زیارت کے قصد کے لیے مخصوص ہے) اور حُجَّةٌ دلیل کو کہتے ہیں۔ جو مقصد مستقیم کو واضح کر دیتی ہے اور مُحَاجَّةٌ یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے ہر ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرنا چاہے۔ (غ)

### منافق یہودی اور آنحضرت ﷺ کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت:

منافق طبع یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو کہہ دیتے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں اور ہماری کتابوں میں ان کی پیشگوئیاں ہیں۔ لیکن جب اپنے علما کے پاس آتے (یہاں ان کو بَعْضُهُمْ کہا ہے۔ شروع سورت میں شَيٰطِيْنِهِمْ کہا ہے) تو وہ علماء ان کو کہتے کہ تم مسلمانوں سے پیشگوئیوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سے ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آجاتی ہے جس کی بنا پر وہ یہودیوں کو ملزم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ خدا تو سب کچھ جانتا ہے۔ تمہارے چھپانے سے کیا بنے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ظہور کی پیشگوئیاں اس وقت یہودیوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

102- ﴿اُمِّيُّوْنَ﴾ اُمِّيٌّ کی جمع ہے امی اس کو بھی کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ یعنی ام کی طرف منسوب شخص گویا جیسا کہ ماں

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

سو ان کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں، پس ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں۔ (103)

---

کے پیٹ سے نکلا تھا ایسا ہی اور اکتساب سے علم حاصل نہیں کیا۔ (ر) یا اس لیے کہ عورتیں ابتدا میں لکھنے پڑھنے سے محروم رہتی تھیں اور عرب کے لوگوں کو بھی امی کہتے ہیں یعنی منسوب بہ ام القری۔ (غ) کیونکہ ام القری مکہ کا نام ہے۔ یہاں ان پڑھ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور جو اہل عرب یہودی ہو گئے تھے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

﴿اَمَانِيَّ﴾ اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے اور یہ مَنِيّ سے ہے جس کے معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور مَنِي جس سے حیوانات پیدا ہوتے ہیں اسی مادہ سے ہے۔ گویا حیوانات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ (غ) اور اسی سے تَمَنِّي ہے جس کے معنی خواہش کرنا ہیں۔ کیونکہ یہ بھی دراصل کسی چیز کا دل میں اندازہ کرنا ہے اور تمنی کا لفظ اکثر ان چیزوں پر بولا جاتا ہے جن کی حقیقت کوئی نہ ہو۔ (غ) اور اُمْنِيَّةٌ وہ صورت حاصلہ ہے جو نفس میں کسی چیز کی تمنی سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ جھوٹ بھی ایک ایسا تصور ہے جس کی حقیقت کوئی نہیں۔ اس لیے تمنی جھوٹ کے لیے مثل مبدأ کے ہو گیا ہے یعنی تمنی سے جھوٹ پیدا ہوتا ہے۔ (غ) مجاہد نے یہاں تمنی کے معنی اسی بنا پر جھوٹ مراد لیے ہیں۔ بعض نے بغیر معنی جاننے کے لفظوں کو پڑھ لینا بھی مراد لیا ہے۔

**یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں:**

آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ بغیر معنی جاننے کے قرآن کریم کو پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں۔ یہودیوں پر ایک وقت وہ آ گیا کہ عوام الناس علم دین سے بالکل بے خبر ہو گئے اور جو کچھ ان کے علماء یا سجادہ نشین کہتے اسے مانتے چلے جاتے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس کو پسند نہیں کرتا کہ علم دین صرف خاص لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ بلکہ چاہتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود علم حاصل کرے تا کہ اندھا ہو کر دوسروں کے پیچھے نہ لگے بلکہ خود بھی کچھ بصیرت سے کام لے سکے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک کام ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ [البقرۃ: 129:2] ''ان کو کتاب اور حکمت سکھائے۔'' بھی ہے اور آپ نے تمام ہی صحابہ کو کتاب و حکمت سکھائی۔ کسی خاص گروہ کو نہیں۔ اسی لیے ایک امی قوم دنیا میں علوم کی مشعل بردار ہو گئی۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت ان آیات کی روشنی میں قابل عبرت ہے وہ نہ صرف علوم سے بے بہرہ اور توہمات میں مبتلا ہیں بلکہ ان کے دنیوی اور دینی لیڈر بھی ان کا علوم سے مستفیض ہونا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس سے ان کی جھوٹی سرداری میں فرق آتا ہے۔

-103 پچھلی آیت میں عوام الناس کا ذکر تھا اس میں علماء کا ذکر ہے جب عوام میں علم کتاب کا نہ رہا تو تحریف کا خوب موقع مل گیا۔

| | |
|---|---|
| وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ | اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی۔کہہ کیا تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے، تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرتا، بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (104) |
| بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ | ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی برائیاں اسے گھیر لیتی ہیں وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ |
| ع 11 9 9 وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع | اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (105) |

---

یہ آیت بائبل کی تحریف لفظی پر قطعی شہادت ہے۔آخری الفاظ میں علماء کی بدعملیوں کی طرف اشارہ ہے۔

104- **یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ کہ عذاب چند روز ہوگا:** یہود کہتے تھے کہ ہم کو صرف چالیس دن عذاب ہوگا اور بعض کہتے تھے سات دن۔سیل کہتا ہے یہودیوں میں مسلم ہے کہ کوئی یہودی خواہ کیسا ہی بدکار ہو گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ دوزخ میں نہ رہے گا۔عیسائیوں نے اس پر یہ ترقی کی ہے کہ مسیح کا تین دن دوزخ میں رہنا تمام بدکاریوں کے لیے کفارہ ہو گیا۔خدا کا کوئی حکم ایسا نہیں بلکہ انجیل میں بھی اعمال کو نجات کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔[متی: 7:22-23] میں معجزات دکھانے والوں کو مسیح کہتا ہے ''اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ''پس نجات بدکار کے لیے نہیں۔

105- ﴿سَيِّئَةً﴾ سُوْءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو انسان کے لیے غم لاتی ہے خواہ امور دنیوی سے ہو یا امور اخروی سے اور خواہ وہ حالت نفس کے متعلق ہو یا بدن کے یا خارجی امر ہو جیسے مال وجاہ کا جاتے رہنا۔(غ) اور ﴿سَيِّئَةً﴾ اس فعل قبیح کو کہا جاتا ہے جو حَسَنَةٌ یعنی بھلائی کی ضد ہے پھر ہر سَيِّئَةٌ اور حَسَنَةٌ دو قسم کی ہے۔اول جو حسب اقتضائے عقل وشریعت ہو اور وہی یہاں مراد ہے اور دوسری وہ جو باعتبار موافقت طبیعت ہو یعنی جو چیز طبیعت کو اچھی معلوم ہو اور طبیعت اس کو ہلکا سمجھے اس پر حَسَنَةٌ کا لفظ بول دیا جاتا ہے اور جو طبیعت پر گراں ہو اس کو سَيِّئَةٌ کہہ دیا جاتا ہے۔(غ) اس معنی میں بہت جگہ قرآن شریف میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔

﴿خَطِيْٓـَٔتُهٗ﴾ خَطأٌ سے ہے جس کے اصل معنی [اَلْعُدُوْلُ عَنِ الْجِهَةِ] یعنی ٹھیک سمت سے ایک طرف ہو جانا۔اور یہ کئی قسم کی ہے۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم (کسی کی) عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں (کے ساتھ) اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے، اور تم منہ موڑنے والے ہو۔(106)

---

اول یہ کہ ارادہ کرے اس کے غیر کا جس کا ارادہ مستحسن ہے پھر اس کو کرے یہ خطأ تام ہے اور اس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔ دوسرے یہ کہ ارادہ ایسی چیز کا کرے جس کا ارادہ مستحسن ہے لیکن جو کچھ ارادہ کیا ہے اس کے خلاف اس سے واقع ہوجائے۔ یہ وہ خطأ ہے جس کے متعلق آتا ہے: [رُفِعَ عَنْ أُمَّتِيْ الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ] (كنز العمال، كتاب التوبة، الفصل الثاني: في أحكام التوبة: 10307) یا [مَنِ اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ] یعنی جو شخص اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد غلط ہوجائے اسے ایک اجر ملتا ہے۔ (غ) یہی خطأ ﴿اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا﴾[البقرة: 286:2] ''اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔'' میں مراد ہے اور سَیِّئَۃٌ اور خَطِیۡٓئَۃٌ میں امام راغب نے یہ فرق کیا ہے کہ خَطِیۡٓئَۃٌ کا لفظ اکثر اس امر پر بولا جاتا ہے جو فی نفسہٖ مقصود الیہ نہیں ہوتا۔

**بدی کا مقابلہ:**

بدی کے لیے کسب کا لفظ اختیار کر کے بتادیا کہ انسان جب ہمہ تن ہی بدی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو چاروں طرف سے بدیاں اس کو گھیر لیتی ہیں۔ پھر اس کے لیے نکلنے کا رستہ نہیں رہتا۔

**نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے:**

جو شخص بدی کے مقابلہ کی کوشش کرتا ہے وہ بدیوں میں گھرتا نہیں بلکہ آخر کار غالب آتا ہے۔ بدی کی کشش گو بہت سخت معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ایک کمزور چیز ہے اور نیکی کی قوت زبردست ہے کیونکہ فطرت نیکی کی معاون ہے اس لیے نیکی اور بدی میں جب مقابلہ ہوگا نیکی غالب آئے گی۔

106- ﴿اِحۡسَانٌ﴾۔ حَسَنٌ وہ شے ہے جو خوش کرتی ہے یا جس میں رغبت کی جاتی ہے۔ بروئے عقل یا بروئے خواہشات یا بروئے حس اور اس کا اکثر استعمال قرآن شریف میں اس پر ہے جو عقل کی رو سے اچھا لگے۔ (غ) یہاں حَسَنٌ سے مراد کلمہ حسنہ ہے یعنی اچھی بات اور احسان ایک اپنے فعل میں ہوتا ہے جیسا اچھا علم یا اچھا عمل۔ جیسے حدیث میں آیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ اور اکثر استعمال اس کا دوسرے پر انعام پر ہے۔

| | |
|---|---|
| وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ | اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا کہ تم اپنے (لوگوں کے) خون نہ گراؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا |

گویا انسان کا حسن متعدی ہوجاتا ہے۔

﴿ذِی الْقُرْبٰی﴾ قُرْبٌ کئی لحاظ سے ہوتا ہے۔نسبت کے لحاظ سے جیسے یہاں۔ پھر نسبت بھی یا باپ کے لحاظ سے ہوگی یا ماں کے۔ پھر قرب مکان وزمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے یا مرتبہ کے لحاظ سے جیسے ﴿مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ میں۔ رعایت یعنی نگہداشت کے لحاظ سے جیسے: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [الأعراف: 56:7] ''اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہے۔'' میں قدرت کے لحاظ سے جیسے: ﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: 16:50] ''ہم اس سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' (غ) مگر یہ علم کے لحاظ سے بھی ہوسکتا ہے۔

﴿الْيَتٰمٰى﴾ يَتِيْمٌ کی جمع ہے۔ اور يُتْمٌ کے معنی انقطاع یعنی کٹ جانا ہیں۔ اور یتیم انسانوں میں سے وہ ہے جو بلوغ سے پہلے باپ سے منقطع ہوگیا ہو۔ یعنی اس کا باپ مرگیا ہو۔ (غ) اور ہر ایک منفرد کو یتیم کہتے ہیں جیسے: دُرَّةٌ يَتِيْمَةٌ۔

﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ تَوَلّٰی کا اصل وَلِیَ سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو خواہ لفظاً یا تقدیراً جیسے یہاں تو اس کے معنی اعراض اور ترک قرب کے ہوتے ہیں۔ (غ)

﴿مُّعْرِضُوْنَ﴾ اَعْرَضَ۔ عَرْضٌ سے ہے جو طول کے خلاف ہے اور غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ﴾ [حٰمٓ السجدۃ: 51:41] ''تو (لمبی) چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے۔'' اور ﴿اَعْرَضَ عَنْهُ﴾ [طٰهٰ: 100:20] کے معنی ہیں اس سے پھر گیا۔ تَوَلّٰی اور اِعْرَاضٌ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تَوَلّٰی یہ ہے کہ جدھر سے آیا تھا ادھر واپس چلا گیا۔ یعنی محض پیٹھ پھیر دی اور اِعْرَاضٌ یہ کہ اس رستہ کو چھوڑ کر اس کی چوڑائی میں چلا گیا۔ گویا نہ صرف حق پر پیٹھ پھیر دی بلکہ باطل کو اختیار کرلیا۔

## توریت کے احکام:

پہلے جب اخذ میثاق کا ذکر کیا تو تفصیل نہ فرمائی تھی۔ اب اسی میثاق کی تھوڑی سی تفصیل کردی ہے کہ کیا کیا حکم تھے۔ یہ احکام گویا اصل الاصول کے رنگ میں ہیں۔ ایک خدا کی عبادت، دوسرے مخلوق خدا سے نیکی۔ توریت میں خدا تعالیٰ کی توحید پر بڑا زور تھا اس تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے اخباری صورت اختیار کی ہے۔ دوسرے حصہ میں سب سے پہلے والدین، پھر رشتہ دار، پھر یتیم، پھر مسکین، پھر عام لوگ۔ پھر اس کی دو نمایاں صورتیں بیان کیں۔ نماز اور زکوٰۃ توریت میں یہ سب احکام موجود ہیں۔ ایک خدا کی عبادت کے لیے دیکھو [خروج: 2-3]، ماں باپ کی عزت [خروج: 2-12]، قریبی [استثناء: 11:15]، یتامیٰ [استثناء: 29:12]، مسکین [استثناء: 11:15]، عام لوگ [خروج: 23] باب کا شروع، نماز [استثناء: 4:13]، زکوٰۃ [خروج: 10:23, 11]، [احبار: 1:25]۔

تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور تم گواہ ہو۔ (107)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۫ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو اور اگر قید ہو کر تمہارے پاس آئیں فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو اس کی سزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے سوائے اس کے کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ (108)

---

107- **اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم:** یہاں خطاب براہ راست کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات یہود عرب سے خاص تعلق رکھتی تھی۔ اور ان کی ایک نمایاں عہد شکنی کا ذکر اس میں ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی طرف خصوصیت سے مسلمانوں کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔ اپنے خون نہ گرانے سے مراد ہے کہ اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرو گے یہ حکم [خروج: 13:20] میں ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھروں سے نکالنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان کے گھروں پر قابض ہونے کا لالچ کرنا۔ دیکھو [خروج: 17:20] اور یا مراد فساد ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض لوگوں کو گھروں سے نکلنا پڑے۔

108- ﴿تَظٰهَرُوْنَ﴾ تَظَاهُرٌ ایک دوسرے کی اعانت کرنا ہے اور ظَهْرٌ بمعنی پیٹھ سے مشتق ہے گویا ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پیٹھ کی ٹیک اپنے ساتھی سے لگاتا ہے۔

﴿بِالْاِثْمِ﴾ اِثْمٌ اور اَثَامٌ ان کاموں کو کہتے ہیں جو ثواب سے پیچھے رکھیں۔ گویا اس کے اصل معنی میں تاخیر ہے۔ (غ) اور حدیث میں اثم کی تعریف کی ہے: [مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تَفْسِيرِ الْبِرِّ وَالإِثْمِ: 6680) یعنی جو چیز تیرے اندر اثر کر جائے اور راسخ ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہے: [وَكَرِهْتَ أَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تَفْسِيرِ الْبِرِّ وَالإِثْمِ: 6680) اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس کی اطلاع پائیں۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا بِٱلۡأٓخِرَةِۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ ٱلۡعَذَابُ وَ

یہی وہ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے اس دنیا کی زندگی کو خرید لیا، پس نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ

﴿الْعُدْوَانِ﴾ عَدْوٌ بمعنی تجاوز سے ہے اور یہ تجاوز کبھی دل سے ہوتا ہے تو اس کو عداوت یا معاودت کہا جاتا ہے اور کبھی چلنے میں ہوتا ہے تو اس کو عدو یعنی تیز رفتاری کہتے ہیں اور کبھی معاملہ میں میانہ روی مدنظر نہ رکھنے سے ہوتا ہے تو اس کو عدوان کہا جاتا ہے اور اثم اور عدوان میں فرق یہ ہے کہ اثم اپنی ذات میں ایک فعل ہے اور عدوان دوسرے پر ظلم ہے۔ پس ان کا فعل حکم الٰہی کے مخالف ہونے کی وجہ سے اثم ہے اور اپنے بھائیوں پر ظلم کی وجہ سے عدوان ہے۔

﴿أُسٰرٰى﴾ اَسِيْرٌ کی جمع ہے یا اَسْرٰی کی جمع جو اَسِيْرٌ کی جمع ہے۔ اور اَسَرَ کے معنی زنجیر سے باندھنا ہیں اور ہر شخص جو پکڑا جائے خواہ زنجیر سے باندھا جائے یا نہ، اسیر ہے۔

﴿تُفٰدُوْهُمْ﴾ فِدَاءٌ اور فِدًى کے معنی ہیں انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کر کے محفوظ کرنا۔ (غ)

﴿الدُّنْيَا﴾ دَنُوٌّ سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور دنیا قریب کی زندگی یا قریب کی منفعت ہے بمقابلہ آخرت کے۔

﴿الْقِيٰمَةِ﴾ قِيَامٌ۔ قَامَ يَقُوْمُ سے مصدر ہے اور پھر ھَا کے اضافہ سے قِيَامَةٌ بن گیا ہے اور اسی کے معنی ہیں انسان کا ایک ہی مرتبہ کھڑا ہو جانا اور اس کے اچانک واقع ہونے کے لیے ہائے تنبیہ داخل کی گئی ہے۔ (غ) اور قیامت یوم بعث ہے جس میں مخلوق حی و قیوم کے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔ (ت)

### تین قیامتیں؛ کبریٰ، وسطیٰ، صغریٰ:

مفردات میں لفظ سَاعَةٌ کے نیچے ہے کہ وہ ساعات جو قیامت ہیں تین ہیں۔ کبریٰ یا حساب کتاب کے لیے لوگوں کا بعث۔ وسطیٰ ایک نسل کا گزر جانا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا: [إِنْ يُطِلْ بِهٰذَا الْغُلَامِ الْعُمُرُ فَلَمْ يَمُتْ هَرِمًا حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ] [مسند أبي يعلى: 23/7؛ قال حسين سليم أسد: حسن] ''اگر اس لڑکے کی عمر لمبی ہو تو یہ نہیں مرے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔'' چنانچہ روایت ہے کہ وہ صحابہ میں سے آخری بزرگ ہیں جو فوت ہوئے اور صغریٰ جو ہر انسان کی موت کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔

### اوس اور خزرج کی جنگوں میں یہودیوں کی شرکت:

مدینہ میں خزرج اور اوس دو بڑی قومیں تھیں جن کی باہم جنگ رہتی تھی اور یہودیوں کی دو بڑی قوموں میں سے ایک بنونضیر خزرج کے حلیف بن گئے تھے اور دوسرے یعنی بنوقریظہ اوس کے۔ یوں یہ اپنے اپنے حلیف سے مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتے اور گھروں سے نکلواتے۔ مگر جب ایک فریق غالب آ کر دوسرے کے قیدی لے لیتا تو پھر دونوں قومیں مل کر چندہ کر کے انہیں چھڑاتیں۔ اس پر انہیں ملزم کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اپنی قوم سے جنگ کرنے کا، آپس میں فساد ڈالنے، اپنے بھائی بندوں کو وطن سے بے وطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی جنت کی امید نہ رکھو بلکہ دنیا سے بدتر عذاب

10 ع 4 10

لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾ع — وہ مدد دیئے جائیں گے۔ (109)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ — اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے پے بہ پے رسول بھیجے (110) اور ہم نے مریم کے بیٹے

---

وہاں ملے گا۔

### یہودیوں کی نظیر دیکھ کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے سے روکا ہے:

یہود کا قصہ بیان کر کے توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی مگر وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر چلے اور جو نقشہ یہاں کھینچا ہے وہ پیشگوئی کے رنگ میں ہے مسلمانوں کا نقشہ ہے۔ ایک طرف تو ہمدردی کا اظہار اس قدر ہے کہ جنگوں میں دنیا کے ایک حصہ میں مسلمان زخمی ہو جائیں تو دوسرے حصہ دنیا میں چندہ ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک ملک دوسرے اسلامی ملک کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے۔ کبھی دوسروں سے مل کر کبھی خود بخود۔ ایک طرف خود مسلمان عیسائیوں کے ساتھ مل کر خلافت اسلامی کو تباہ کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے قیام کے لیے اپیلیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔

### مسلم کی تعریف:

یہود کا قصہ بیان کر کے سمجھایا ہے کہ کچھ بھی حالات ہوں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کر کے ان کا خون گرانا اور ان کا ملک چھیننا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے: [الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ] [صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ: 10؛ صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بَيَانِ تَفَاضُلِ الإِسْلاَمِ وَأَىِّ أُمُورِهِ أَفْضَلُ: 171] مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان دکھ نہ اٹھائیں۔ ہاتھ سے دکھ دینا یہ ہے کہ ان کو قتل کریں، ان کا مال لوٹیں، ان کے ملک چھینیں۔ زبان سے یہ کہ ان کی عزت پر حملہ کریں، گالی دیں، کافر کہیں، باہم جنگ کر کے باہم فساد کر کے دنیا کی زندگی میں پوری رسوائی حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن اس رسوائی میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے۔

### فتاویٰ کفر سے قوم کی تباہی:

اور جب حکومت گئی تو اب ویسے ایک دوسرے کو کافر بنا کر اپنی قوم کی تباہی کے درپے ہیں۔ علماء اور مشائخ کو یہ فکر نہیں کہ کافروں کو مسلمان بنائیں یا اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دیں۔ بلکہ مسلمانوں کو کافر بنانا ان کا شیوہ ہے۔

109- اب کلام کا رخ اس طرف پھیرا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے عہد شکنیاں کیں۔ اب جب ان کی ہدایت کا سامان پھر آیا تو انہوں نے دنیا کی خاطر پھر دین کو ترک کر دیا۔ اگر وہ ہدایت کو اختیار کر لیتے تو ان کا عذاب دور کر دیا جاتا۔ ان کی نصرت ہوتی مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

110- ﴿قَفَّيْنَا﴾ قَفَا کے معنی پیٹھ ہیں اور قَفَّيْتُهٗ کے معنی اس کو اس کے پیچھے رکھا۔

مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا

عیسیٰ کو کھلے دلائل دیئے اور روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی۔ (111) پس کیا جب بھی کوئی رسول تمہارے

﴿بِالرُّسُلِ﴾ رَسُوْلٌ کی جمع ہے اور رسول اصل میں وہ ہے جو کسی قول اور رسالت کا متحمل ہو۔ (غ) پس بغیر کسی رسالت کے رسول کا لفظ حقیقی معنی میں اطلاق نہیں پا سکتا۔

**لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر:** اللہ کے رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام اس کی مخلوق کے لیے لاتے ہیں مگر مجازاً اس کا اطلاق دوسرے پر جائز ہے۔ جیسے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ﴾ [المؤمنون: 51:23] ''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ۔'' میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے برگزیدہ صحابہ شامل ہیں دیکھو مفردات راغب۔ اور ایسا ہی لفظ مرسل مجازاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر بولا گیا ہے: ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یٰس: 13:36] ''اور ان کے لیے گاؤں کے رہنے والوں کی مثال بیان کر، جب ان کے پاس رسول آئے۔'' پس مجازاً اس کا اطلاق اس امت کے مجددین پر جو مامور بھی ہوتے ہیں جائز ہے نہ حقیقتاً۔ ملائکہ پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان وسائط ہیں اور انبیاء پر جو خدا کی طرف سے مخلوق کے لیے کوئی خبر لاتے ہیں۔ یہ لفظ بالخصوص بولا گیا ہے اور ایک فرستادہ یا قاصد پر بھی بولا جاتا ہے جیسے: ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾ [فاطر: 1:35] ''فرشتوں کو رسول بنانے والا۔'' ﴿فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ﴾ [یوسف: 50:12] ''سو جب ایلچی اس کے پاس آیا۔''

## سلسلہ رسل بنی اسرائیل:

سلسلہ بنی اسرائیل میں انبیاء کے آنے کو اب بطور نعمت بیان کیا ہے اور اول سلسلہ حضرت موسیٰ اور آخر سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا نام لے کر باقی ناموں کو چھوڑ دیا۔ کتاب سے مراد یہاں شریعت کی کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ یہ شریعت سب انبیاء کے لیے ایک ہی رہی۔ ہاں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں انبیاء کچھ کمی بیشی کرتے رہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے: ﴿وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ [آل عمران: 50:3] ''اور تا کہ اس کا کچھ حصہ تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں۔ جو تم پر حرام کیا گیا ہے۔''

## رسول کے لیے ہدایت لانا ضروری ہے:

چنانچہ خود قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل، حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور دیا جانے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر پر فرمایا کہ جو کچھ کوئی رسول تمہارے پاس لاتا تھا تم اس کو قبول نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہر ایک رسول کچھ نہ کچھ ہدایت بھی لاتا تھا جسے لوگ قبول نہ کرتے تھے۔ جس کو بَيِّنَاتٌ یعنی معجزات یا پیشگوئیوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے اور معجزات یا پیشگوئیاں محض تائید کے لیے ہوتی ہیں۔

111- ﴿عِيْسَى﴾ اس کا اصل عَيَسٌ اور وزن فعلیٰ ہے۔ (ل) اور عرب کے لوگ اس اونٹ کو اَعْيَسُ کہتے ہیں جس کی سفیدی

لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ پاس وہ چیز لایا جسے تمہارا جی نہیں چاہتا تھا، تو تم نے تکبر

پر کچھ تاریکی ہو اور [عَيْسٌ، مَآءُ الْفَحْلِ] کو کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی سے لفظ عیسیٰ کا اشتقاق ہو۔ (غ) مگر بعض اہل لغت کے نزدیک یہ عجمی ہے حالانکہ سریانی میں یہ لفظ عیسیٰ نہیں بلکہ الیسوع ہے اور انجیل میں یسوع آیا ہے۔ جس کے معنی سیّد یا مبارک ہیں۔ (ر)

مریم کے معنی عبرانی میں خادمہ یا عابدہ ہیں مگر قاموس میں ہے کہ مریم عربی لفظ ہے اور اس عورت کو کہتے ہیں: [اَلَّتِيْ تُحِبُّ مُحَادَثَةَ الرِّجَالِ وَلَا تَفْجُرُ.] (القاموس المحيط؛ تاج العروس؛ تهذيب اللغة) ''جو مردوں سے بات کرنا پسند کرے مگر گناہ نہ کرے۔''

﴿الْبَيِّنٰتِ﴾ بَيِّنَةٌ کی جمع ہے جو بان (ظاہر ہوا) سے ہے اور اس کے معنی ہیں کھلی دلیل خواہ عقلی ہو یا محسوس۔ (غ) اس میں معجزات پیشگوئیاں دلائل سب شامل ہیں۔

## روح القدس:

مفردات میں ہے کہ روح نفس کے معنی میں بھی آتا ہے اور اشراف الملائکہ کو بھی کہا ہے جبریل علیہ السلام کو بھی جسے روح القدس اور روح الامین کے نام سے یاد کیا ہے۔ خود قرآن یعنی کلام الٰہی کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [الشوریٰ: 52:42] ''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح بھیجی۔'' کیونکہ اسی سے زندگی ملتی ہے یہاں روح القدس سے مراد بعض کے نزدیک جبریل ہیں اور بعض کے نزدیک انجیل۔ (ج)

## ابن مریم نام کی وجہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔ یہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔ اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہے: ''اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکہ پاک ٹھہرے۔'' [أيوب: 14:25] پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا، بلکہ عورت لائی۔ کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلایا۔ پس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے تو تم اسے دوسرے انسانوں سے بے گناہی کا امتیاز اس بنا پر کیونکر دے سکتے ہو۔ کیونکہ جب اصلی گنہگار حوا ہوئی اور اس کے ورثہ میں گناہ کا چلنا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے۔ تو مریم اس سے کیوں کر پاک ٹھہری۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں۔ اس لیے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔ جیسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ۔

## روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰ سے:

حضرت عیسیٰ سے روح القدس کا تعلق وہی ہے جو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مومنوں کو بھی روح القدس کی تائید ملتی ہے فرمایا: ﴿اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ [المجادلة: 22:58] ''اور اپنی روح سے ان کی تائید کی ہے۔'' جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے یعنی اپنی روح

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

(ہی) کیا، پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے۔ (112)

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی، پس وہ بہت ہی کم مانتے ہیں۔ (113)

---

سے ان کی تائید کی اور حدیث میں ہے: [اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ (حَسَّانَ) بِرُوحِ الْقُدُسِ] (صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب الشِّعْرِ فِي الْمَسْجِدِ: 453) ''اے اللہ تو حسان کی تائید روح القدس سے فرما۔'' حضرت مسیح کی بینات اور تائید روح القدس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا کہ یہودی ان کا انکار کرتے اور ان کو ناپاک قرار دیتے تھے۔

112- **یہودیوں کا شیوہ تکذیب و قتل انبیاء:** اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے تمہاری عداوت اس وجہ سے نہیں کہ تم کو دلائل نہیں ملتے بلکہ تم ایسے قسی القلب ہو گئے ہو کہ ہمیشہ ہی خدا کے رسولوں کی تکذیب کرتے رہے۔ بلکہ اگر ایک گروہ کے قتل کے بھی درپے ہوئے۔ چنانچہ كَذَّبْتُمْ کو ماضی رکھ کر اور تَقْتُلُوْنَ کو مضارع رکھ کر یہ بتایا ہے کہ تم اس وقت بھی ایک رسول کے قتل کے درپے ہو اور اپنی طرف سے تو تم نے اسے قتل کر ہی دیا تھا اگر اللہ تعالیٰ اس کا بچانے والا نہ ہوتا۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے: [أَنْتُمُ الْآنَ فِيْهِ فَإِنَّكُمْ حَوْلَ قَتْلِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَلَوْلَا أَنِّيْ أَعْصِمُهُ لَقَتَلْتُمُوْهُ] (روح المعاني، جلد1، صفحہ 318) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے قتل کے درپے ہونے پر یا اس کے اسباب قتل کے جمع کر دینے پر بھی قتل کا لفظ بول دیا جاتا ہے گو وہ شخص فی الواقع مقتول نہ ہو۔

113- ﴿غُلْفٌ﴾ غُلْفٌ یا اَغْلَفُ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو غلاف میں ہو اور اس سے ان کی مراد علوم توریت کے غلاف ہیں اور یا غلاف کی جمع ہے یعنی ہمارے دل خود علم کے غلاف یا علم کے وِعاء ہیں۔ (غ) یعنی علم ان کے اندر بھرا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے کچھ سیکھنے کے محتاج نہیں۔

﴿لَّعَنَهُمْ﴾ لَعَنَ۔ کے اصل معنی ہیں ناراضگی کی وجہ سے نکال دینا ہے اور دور کر دینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں لعنت کے ہونے سے مراد سزا کا دینا ہے۔ اور دنیا میں لعنت یہ ہے کہ ایک شخص اس کی رحمت اور اس کی توفیق سے کٹ جائے۔ (غ) اور شماخ بن ضرار کے شعر میں آتا ہے: [مَقَامُ الذِّئْبِ كَالرَّجُلِ اللَّعِيْنِ] جہاں [اَلرَّجُلُ اللَّعِيْنِ] سے مراد دور پھینکا گیا انسان ہے۔ (ج)

﴿فَقَلِيْلًا مَّا﴾ ما۔ قلیل کے لیے بطور تاکید بڑھایا گیا ہے یعنی بہت ہی کم۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو ان کے پاس ہے اور پہلے وہ ان پر جو کافر تھے فتح مانگا کرتے تھے۔ مگر جب اُن کے پاس وہ آیا جسے انہوں نے پہچانا اس کا انکار کر دیا پس انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ (114)

---

### دلوں کے پردے:

یہودیوں کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل ایسے پردوں کے اندر ہیں کہ آپ کی بات ان میں داخل نہیں ہوسکتی۔ جیسے دوسری جگہ: ﴿قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ [حٰمٓ السجدۃ: 5:41] ''ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں۔ جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔'' گویا یہ خلقی پردے ہیں اور یا یہ کہ ہمارے دلوں میں پہلے ہی علم بھرا ہوا ہے ہم تم سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم رحمت اور توفیق الٰہی سے دور جا پڑے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم بہت کم ہی مانتے رہے ہو۔

114- ﴿يَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ اِسْتِفْتَاحٌ فَتَحَ سے ہے اور اس کے ایک معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ذریعہ سے خدا کی مدد مانگا کرتے تھے اور یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ اس کی خبر چاہتے تھے کبھی لوگوں سے پوچھتے، کبھی کتابوں سے استنباط کرتے تھے یا یہ کہ دوسری قوموں پر اس ذریعہ سے غلبہ مانگتے تھے۔ (غ) اور ﴿يَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ بمعنی يَفْتَحُوْنَ بھی ہوسکتا ہے۔ (ض) یعنی نبی آخر الزمان کے آنے کی خبریں بت پرستوں کو سنایا کرتے تھے۔

### بنی اسرائیل اور نبی موعود:

چونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ نبی موعود پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں ممتاز قوم بنائے گا۔ [استثنآء: 12:28] و[ 18, 15:18] اس لیے جب دنیا میں بوجہ انبیاء کے انکار کے ذلیل ہوگئے تو پھر خدا سے یہ دعائیں مانگنے لگے کہ وہ موعود نبی آئے تو ہمیں کافروں پر غلبہ ملے۔ لیکن جب وہ کتاب آ گئی جو ان کی وحی کی تصدیق کرتی تھی اور یہی موعود نبی کی سب سے بڑی علامت تھی کہ وہ دنیا کے کل انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرے گا تو اسے رد کر دیا۔

### موعود نبی کی شناخت:

یہاں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں اس لیے کہ نہایت بین اور موٹے نشان آپ کی صداقت کے ان پر کھل چکے تھے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ اب تک کسی نبی نے نہ کیا تھا۔ صرف آنحضرت ﷺ نے کیا۔ دوسرے انبیاء کی تصدیق کسی نبی نے نہ کی تھی۔ صرف آپ نے کی۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

کیا ہی برا ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے اتارا، اس حسد سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارے، پس وہ غضب پر غضب میں آگئے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔[115]

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا

---

اس موعود نبی کا انکار اللہ کی جناب سے دوری ہے۔ صرف اس کی ہدایت پر عمل کر کے وہ خدا تک رسائی حاصل کر سکتے تھے جب اس کو رد کر دیا تو خود ہی دوری یا لعنت کو خرید لیا۔

115- ﴿بِئْسَمَا﴾ بِئْسَ۔ بُؤْسٌ سے ہے جس کے معنی شدت اور مکروہ ہیں اور بِئْسَ ہر ایک مذمت کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے نَعَمْ ہر ایک مدح کے مقام پر۔ (غ) بَائِسٌ اور بَأْسَاءُ اسی مادہ سے ہیں۔

﴿بَغْيًا﴾ بَغْی کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنا۔ (غ) اور بغی مذموم بھی ہے اور محمود بھی مگر اکثر استعمال اس کا محل ذم میں ہے۔ یہاں بَغْی سے مراد حسد ہے۔ (غ)

﴿مُّهِيْنٌ﴾ اَهَانَ سے اسم فاعل ہے اور هَوَانٌ دو طرح پر ہے۔ ایک انسان کا اپنے آپ میں تذلل اختیار کرنا اس سے پستی اس کے لاحق حال نہیں ہوتی اور مدح کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے: ﴿يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: 25:63] ''جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں۔'' یا حدیث میں [اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لَيِّنٌ] (شعب الإيمان للبيهقي، كتاب حسن الخلق، فصل في لين الجانب وسلامة الصدر: 7775) مومن انکسار اختیار کرنے والا نرم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ دوسرا انسان اس پر متسلط ہو کر اس کی خفت کرنا چاہتا ہے۔ (غ) اور یہ ذلت ہے گویا دوسرے کا محکوم ہونے کی حالت خود ایک ذلت یا عذاب مہین ہے۔

**یہودیوں کا حسد آنحضرت ﷺ سے:**

جس انکار کا ذکر پچھلی آیت میں ہے اس کی وجہ بتائی کہ وہ صرف حسد ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کا حصہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور قوم پر کیوں اتارا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی اور بھی تشریح فرمائی ہے۔ جہاں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم صرف اسی پر ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اترے۔ غضب پر غضب اس لیے فرمایا کہ ایک غضب کے نیچے تو وہ پہلے ہی آئے ہوئے تھے، اب آنحضرت ﷺ کے انکار سے اور غضب کے نیچے آگئے۔ عذاب مہین یا رسوا کرنے والا عذاب یہ ہے کہ دوسرے کے ماتحت رہیں۔

قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

ہے، کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنیوالا جو ان کے پاس ہے، کہہ تو پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اگر تم مومن تھے۔(116)

وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور بے شک موسیٰ تمہارے پاس کھلی دلیلیں لایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑا (معبود) بنالیا اور تم ظالم تھے۔(117)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ۗ وَ

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا جو ہم نے تم کو دیا ہے اسے زور سے پکڑ لو اور سن لو انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور نہیں مانتے(118) اور ان

116- **اس کا جواب کہ غیر بنی اسرائیل سے نبی آنا کیوں ضروری تھا:** ان کے اس قول کا کہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی دوسری قوم کے آدمی پر اگر وحی نازل ہو تو اس کو ہم نہیں مانیں گے۔ ایک جواب تو یہ دیا کہ یہ وحی تمہاری وحی کی مصدق ہے اور یہی اس موعود نبی کا نشان تھا۔ دوسرا یہ کہ تمہارا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ نبی ہوتا تو تم ایمان لے آتے۔ پہلے تم اسرائیلی نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے۔ پہلے جواب میں یہ بھی بتایا کہ اگر بنی اسرائیل کے باہر سے یہ نبی نہ آتا تو تمہاری پیشگوئیاں غلط ٹھہرتیں۔ کیونکہ پیشگوئیوں میں بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آنے کا وعدہ ہے اور پھر عرب کا نام بھی موجود ہے۔ پھر موسیٰ کی مثل نبی موسیٰ کے خلفاء میں سے تو ہو نہ سکتا تھا اس لیے اس کا دوسری قوم سے آنا ضروری ہوا۔

117- ان کے انکار کے سارے قصہ کو پھر دہرایا ہے اور ملزم کیا ہے کہ انبیاء تو ایک طرف رہے خود موسیٰ کے زمانہ میں تم نے شرک کا ارتکاب کیا جب بچھڑا بنا کر اس کی عبادت کرنے لگے۔

118- ﴿اسْمَعُوْا﴾ سَمْعٌ کے اصل معنی سننا ہیں مگر علاوہ شنوائی کے قرآن شریف میں کبھی اس سے مراد فہم اور کبھی طاعت لی گئی ہے۔ (غ) یہاں سن لینے سے مراد سمجھ لینا یا فرمانبرداری ہی ہے کیونکہ یہی سننے کی اصل غرض ہوتی ہے۔

**منہ سے دعویٰ ایمان اور عملی نافرمانی:**

باوجود سخت عہد کے تم نے اس کی ایسی نافرمانی کی کہ گویا تم نے منہ سے ہی کہہ دیا کہ ہم نافرمانی کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سَمِعْنَا

اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۹۳

کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا رچ گیا(119) کہہ وہ برا ہے جس کے لیے تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۹۴

کہہ اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ہے، تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو۔(120)

---

یعنی ہم نے سن لیا منہ سے کہا اور عَصَيْنَا یعنی ہم نے نافرمانی کی دل سے کہا۔ یا زبان قال سے کہا سَمِعْنَا اور زبان حال سے کہا عَصَيْنَا۔ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ منہ سے قرآن پر ایمان کا دعویٰ ہے مگر عملی حالت میں نافرمانی۔

119- ﴿اُشْرِبُوْا﴾ شُرْبٌ پانی یا دوسری سیال چیزوں کے پینے پر بولا جاتا ہے۔(غ) جب کسی چیز کا اندر سرایت کر جانا بتانا ہو تو اس کو پینے کی چیز سے مشابہت دیتے ہیں۔ کیونکہ پانی فوراً روم روم میں پہنچ جاتا ہے اور بچھڑا رچ جانے سے مراد بچھڑے کی محبت کا رچ جانا ہے۔(غ) مراد یہ ہے کہ وہ شرک کی بیماری جو بچھڑے کی پرستش میں تم سے ظاہر ہوئی وہی تمہارے اندر چلی آتی ہے۔

**توریت کی غلطی کی اصلاح:**

توریت میں یہ ذکر ہے کہ بچھڑے کو جلا کر خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلا دیا تھا[خروج 20:32]۔ مگر یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ قرآن کریم نے ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمُ﴾ بڑھا کر بتا دیا کہ یہ بھی یہود کو کوئی ظاہر الفاظ سے غلطی لگی ہے اور تحریف ہوگئی ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرماتا ہے کہ خاکستر کو دریا میں ڈال دیا: ﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾[طٰهٰ: 97:20]
''ہم اسے جلا دیں گے، پھر اسے دریا میں اچھی طرح بکھیر دیں گے۔''

120- **یہودیوں سے مباہلہ:** موت کی آرزو کرنے سے مراد جھوٹے کی موت کی دعا کرنا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں عیسائیوں کو مباہلہ کے لیے بلایا۔ یہاں یہودیوں کو ایک قسم کے مباہلہ کے لیے بلایا۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: [اُدْعُوْا بِالْمَوْتِ عَلٰى أَيِّ الْفَرِيْقَيْنِ أَكْذَبُ] دعا کرو کہ جو فریق جھوٹ پر ہے اس کو موت آجائے۔ اگر تم مقبولان بارگاہ الٰہی ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو خدا تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے وہ ایسی دعا کی کبھی جرأت نہ کریں گے۔

**آرزوئے موت:** بعض نے موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ

| | |
|---|---|
| وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ | اور کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بسبب اس کے جو ان کے ہاتھ پہلے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔ |
| وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚۛ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع | اور یقیناً تو ان کو سب لوگوں سے بڑھ کر لمبی زندگی پر حریص پائے گا اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار برس کی عمر دی جائے اور یہ بات اسے عذاب سے بچا نہیں سکتی کہ اسے لمبی عمر دی جائے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (121) |

مُعَانَقَة 2 — ع 10/11 11

مومن موت سے خائف نہیں ہوتا۔ مگر تم موت سے خائف ہو۔ مگر یہ معنی کچھ موزوں نہیں اور پہلے معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسا مفسر بھی وہی معنی کرتا ہے۔

121- ﴿اَحْرَصَ﴾ حَرِيْصٌ سے افعل ہے اور حِرْصٌ کے معنی ہیں بہت زیادہ ایک چیز کو چاہنا۔ (غ)

﴿اَشْرَكُوْا﴾ شِرْكَةٌ یہ ہے کہ ایک چیز دو یا دو سے زیادہ کے لیے پائی جائے اور دین میں شرک دو قسم کا اول شرک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ دوم شرک صغیر۔ یعنی کسی امر میں غیر اللہ کی رعایت ملحوظ رکھنا۔ (غ) حدیث میں ہے: [اَلشِّرْكُ فِيْ أُمَّتِيْ أَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ عَلَى الصَّفَا] (کنز العمال: 7501) یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کے صاف جگہ پر چلنے سے بھی زیادہ خفی ہے۔

﴿بَصِيْرٌ﴾ بَصَرٌ آنکھ کو کہتے ہیں اور دیکھنے کی قوت کو بھی اور دل میں جو قوت مدرکہ ہے اس کو بَصِيْرَةٌ بھی کہتے ہیں اور بصر بھی۔ (غ) اور اَلْبَصِيْرُ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور اس سے مراد ہے کہ وہ تمام اشیاء کو دیکھتا ہے۔ ظاہر کو بھی اور مخفی کو بھی بغیر کسی آلہ کے۔ اور بصر اس کے حق میں وہ صفت ہے جس سے تمام اشیاء کے کمال اوصاف کا انکشاف ہوتا ہے۔ (ت)

﴿بِمُزَحْزِحِهٖ﴾ زَحْزَحَ۔ زَحٌّ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

﴿يُعَمَّرُ﴾ عِمَارَةٌ آباد کرنا ہے یعنی ویرانی کا نقیض۔ اس لیے عَمْر اور عُمُر وہ مدت ہے جس میں جسم زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور قسم میں عَمْر کا لفظ آتا ہے جیسے: ﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِىْ سَكْرَتِهِمْ﴾ [الحجر: 72:15] ''تیری زندگی کی قسم وہ اپنی بدمستی میں ہیں۔'' اور تعمیر جس سے يُعَمَّرُ مضارع ہے عمر کا عطا کرنا ہے۔ (غ)

## ہزار سال کی زندگی:

یہاں یہ بیان کیا ہے کہ ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کے لیے سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے

| | |
|---|---|
| قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ | کہہ جوکوئی جبریل کا دشمن (ہو)(122) اس نے تو اللہ کے |
| عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ | حکم سے اس کو تیرے دل پر اتارا، اس کی تصدیق کرتا |

بھی بڑھ کر حریص پاؤ گے اور مشرکوں سے مراد بعض لوگوں نے محض مشرک لیے ہیں۔اس لیے کہ وہ بعث بعد موت کے قائل نہیں۔اس لیے اس دنیا کی زندگی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔اور بعض نے مجوس کو مراد لیا ہے۔جو جیسا کہ ابن جریر میں ہے چھینک پر ''ہزار سال بزی'' کی دعا دیتے تھے یعنی ہزار سال زندہ رہو۔اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ سے نیا بیان شروع ہوتا ہے اور ان مشرکوں سے مراد اہل کتاب کے مشرک یعنی عیسائی لوگ ہیں بمقابلہ یہود کے۔گویا فرمایا کہ یہودی تو دنیا میں مبتلا ہوکر اس دنیا کی زندگی پر حریص ہیں ہی مگر ان کے مشرک بھائی یعنی عیسائی تو ایک ہزار سال کی زندگی چاہتے ہیں۔

## عیسائیت کی مخالفت اسلام:

اس صورت میں ہزار سال کی زندگی سے مراد ایک قوم کی مخالفت اسلام کی ہزار سال کی زندگی ہو جیسا کہ دوسری جگہ ہے: ﴿اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا﴾ [طٰہٰ: 104:20] ''تم صرف ایک دن ہی ٹھہرے۔'' اور یوم بھی خدا کے ہاں ہزار سال کا ہے تو مراد ہوگی کہ عیسائی اگر ایک ہزار سال بھی اسلام کی مخالفت کرلیں اور غالب رہیں تو بھی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔

122- ﴿لِّجِبْرِيْلَ﴾ جبریل بخاری میں عکرمہ کا قول ہے کہ جبریل، میکائیل، اسرافیل سب بمعنی عبداللہ ہیں جبر یا میک یا سراف کے معنی عبد اور ایل بمعنی اللہ۔مگر جبریل جبر اور ائل سے مرکب ہوسکتا ہے۔جبر کے معنی کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا ہے اور اس لیے جبر سلطان یعنی بادشاہ کو بھی کہتے ہیں۔(غ) اور ائل اَوْل سے ہے یعنی رجوع کرنے والا۔پس جبریل وہ ہے جو اصلاح کرنے والے بادشاہ کی طرف بار بار رجوع کرتا ہے۔

## جبریل علیہ السلام اور یہودی:

کئی ایک صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہودی جبریل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔چنانچہ صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے: [ذَاكَ عَدُوُّ الْيَهُودِ مِنَ الْمَلاَئِكَةِ] (صحيح البخارى، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى (وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى الأَرْضِ خَلِيفَةً): 3329) اور بعض روایات میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ وہ جبریل علیہ السلام کو [مَلَكُ التَّشْدِيْدِ وَالْعَذَابِ] یعنی سختی اور عذاب کا فرشتہ سمجھتے تھے۔

## جبریل ؑ کا وحی لانا:

حالانکہ بائبل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ فرشتہ ہے جو وحی لاتا تھا۔چنانچہ [دانیال: 16:8] میں جبریل کو حکم ہوتا ہے کہ دانیال کو اس کی رؤیا کے معنی سمجھادے اور [لوقا: 19:1 ,26] سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم میں بھی یہی فرمایا ہے کہ

يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ ہوا جو اس سے پہلے ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور خوش خبری (ہے)۔(123)

---

جبریل اللہ تعالیٰ کی وحی آنحضرت ﷺ پر لاتے تھے۔ جیسا کہ یہاں بھی صاف فرمایا۔ اور احادیث سے حضرت جبریل علیہ السلام کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ رمضان میں قرآن کریم کا دور کرنا ثابت ہے۔ اور بخاری سے ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہی فرشتہ جو آنحضرت ﷺ پر وحی لایا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی وہی وحی لاتا تھا۔ دیکھو ورقہ کا قول [كِتَابُ الْوَحْيِ، بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ] میں [هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوسٰى]۔ معلوم ہوتا ہے یہودیوں کا یہ عقیدہ اس لیے ہو گیا کہ جب جبریل علیہ السلام کسی نبی پر وحی لاتا تو وہ اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے انکار کرتے اور ان پر عذاب آتا اس لیے وہ عذاب کو جبریل کی طرف منسوب کرنے لگ گئے۔

پچھلے رکوع میں یہود اور عیسائیوں کی اسلام کے ساتھ عداوت کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس رکوع میں ان کی عداوت کا کھول کر ذکر کیا ہے کہ یہاں تک ان کی عداوت ترقی کر گئی ہے کہ خود جبریل علیہ السلام سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔

123- ﴿نَزَّلَهٗ﴾ نَزَّلَ۔ تَنْزِيْلٌ اور اِنْزَالٌ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تنزیل اس موقعہ کے ساتھ خاص ہے جہاں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنے کی طرف یا سورتوں اور آیات کے یکے بعد دیگرے نزول کی طرف اشارہ ہو اور انزال عام ہے۔ (غ)

قلب کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف پھیرنا۔ (غ) قلب دل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا اس لیے کہ خیالات کو پھیرتا ہے اور قلب کے معنی کسی چیز کا اصل یا اس کا لُبّ بھی ہیں۔ (ت) حدیث میں ہے: [إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا وَقَلْبُ الْقُرْآنِ يٰسٓ] (جامع الترمذي، كتاب فضائل القرآن، باب مَا جَاءَ فِي فَضْلِ يس: 3129) ہر چیز کا ایک قلب ہے اور قرآن کا قلب یس ہے۔ یہاں ابن اثیر نے قلب کے معنی لُبّ اور اصل ہی کیے ہیں۔

## قلب پر نزول قرآن سے مراد:

پس انسان کے جسمانی قلب کے مقابلہ پر ایک قلب اس کی روحانیت کا مرکز ہے اور اسی کا یہاں ذکر ہے۔ نزول وحی اس قلب پر ہوتا ہے۔ بعض نے ﴿نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ سے یہاں مراد لی ہے: [جَعَلَ قَلْبَكَ مُتَّصِفًا بِأَخْلَاقِ الْقُرْآنِ] (ر) تیرے دل کو اخلاق قرآنی سے متصف کیا۔

﴿بِإِذْنِ﴾ اُذُنٌ کان کو کہتے ہیں اور اُذُنٌ یا اَذَانٌ وہ چیز ہے جو سنی جائے اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ سماع کے ذریعہ سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ اور کسی چیز میں اذن اس کی اجازت کا علم دینا ہے اس لیے اذن اللہ سے مراد یہاں اس کا ارادہ اور اس کا امر ہے اور جہاں اُذُنٌ بمعنی علم آتا ہے تو وہ ایسا علم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ہو۔ اس لیے یہ خاص ہے اور علم عام ہے۔

﴿بُشْرٰى﴾ بَشَرَةٌ چمڑے کے ظاہر کو یعنی اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں جیسے اَدَمَةٌ اس کے اندر کی طرف کو کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ (ان) کافروں کا دشمن ہے۔(124)

---

انسان کو بَشَرٌ کہا جاتا ہے اور بُشْرٰی اور بَشَارَةٌ خوش کرنے والی خبر کو کہتے ہیں۔(غ) اس لیے کہ اس سے انسان کے چہرہ کے بشرہ میں بسط پیدا ہوتا ہے۔

### جبریل کا آنحضرت ﷺ پر وحی لانا:

جیسا کہ پچھلے نوٹ سے ظاہر ہے۔ بائبل سے بھی یہی ثابت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام انبیاء پر وحی لاتے تھے گو یہودیوں نے غلطی سے جبریل کو عذاب کا فرشتہ سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے جب جبریل کا ذکر آیا تو فرمایا کہ جس طرح وہ پہلے انبیاء پر وحی لاتا تھا اسی طرح تیرے قلب پر بھی وحی الٰہی کا لانے والا ہے۔ اور یہ وحی پہلی وحی کی مصدق ہے اور مان لینے والوں کے لیے اس میں بشارت بھی ہے۔ پس وہ ملک عذاب نہیں بلکہ ہدایت اور بشارت لانے والا ہے۔

124- ﴿عَدُوًّا﴾ عُدُوٌّ کے معنی تجاوز یعنی حد سے گزرنا اور موافقت کا نہ ہونا ہیں۔ بلحاظ دل ہو تو عَدَاوَةٌ اور مَعَاوَدَةٌ یعنی دشمنی ہے۔ چلنے کے لحاظ سے ہو تو عدو ہے۔ معاملہ میں یا عدالت میں خلل کے لحاظ سے ہو تو عدوان اور عدو یعنی زیادتی ہے۔

### اور عدو یعنی دشمن دو طرح پر ہوتا ہے:

ایک ارادہ اور قصد سے جیسے: ﴿مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ﴾ [النسآء: 92:4] ”ایسے لوگوں سے ہو جو تمہارے دشمن ہوں۔“ اور ایک وہ جو ارادہ اور قصد سے نہیں بلکہ دوسرے کے لیے ایسی حالت پیش کرے جس سے اس کو تکلیف پہنچے جس طرح دشمن سے پہنچتی ہے۔ جیسے بتوں کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرمانا: ﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الشعرآء: 77:26] ”تو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہانوں کا رب۔“ یا جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ [التغابن: 14:64] ”تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں۔“ (غ) اللہ تعالیٰ کا کافروں کا دشمن ہونا اسی لحاظ سے ہے یعنی ان کے ساتھ اس کا معاملہ ایسا ہوگا یا اس کی طرف سے ان کو سزا پہنچے گی۔

یہاں بتایا ہے کہ جبریل کے ساتھ دشمنی اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سب سے دشمنی ہے (میکائیل کا نام اس لیے بڑھایا کہ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ [دانیال: 12:1] میں میکائیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے۔“) اور جو شخص اللہ اور ملائکہ سے دشمنی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے شخص کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا یَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور یقیناً ہم نے تیری طرف کھلی باتیں اتاریں اور سوائے فاسقوں کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔(125)

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور کیا جب کبھی وہ کوئی عہد باندھتے ہیں انہی کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس ایک رسول آیا اس کی تصدیق کرنے والا جو ان کے پاس ہے تو ان میں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں۔(126)

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰكِنَّ

اور ان باتوں کی پیروی کی جو شیطان سلیمان کی نبوت پر افترا کرتے تھے(127) اور سلیمان نے کفر نہیں

---

**اللہ کی عداوت کا مفہوم:**

عداوت سے اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس لفظ کا استعمال محض ان کی عداوت کی سزا کے اظہار کے لیے ہے۔ اس استعمال کے لیے [دیکھو نمبر: 27]۔

125- ﴿الْفٰسِقُوْنَ﴾ فاسق یہاں ان کو اس لیے کہا کہ ان سے نبی آخر الزمان کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا۔ اس عہد کو زیادہ واضح الفاظ میں اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ فاسق کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 41]۔

126- ﴿نَّبَذَهٗ﴾ نَبَذٌ کسی چیز کا پھینک دینا ہے جب اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے۔ (غ)

اور بھی زیادہ تصریح فرمائی کہ ان لوگوں نے خدا کی کتاب توریت کی بھی پروانہ کی کیونکہ اس میں نبی ﷺ کے متعلق عہد مذکور تھا۔

127- ﴿تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰى﴾ تلی یا تلاوت کا لفظ کتب منزل من اللہ کے لیے خاص ہے۔ [دیکھو نمبر: 67]۔ تلی عَلَیْهِ کے ایک معنی تو یوں ہوں گے کہ اس کو پڑھ کر سنایا۔ جیسے: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ شیاطین ملک سلیمان کو تو کچھ پڑھ کر نہ سناتے تھے۔ اس لیے یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ [یَتْلُوْا عَلٰى فُلَانٍ] کے معنی ہیں [یَكْذِبُ عَلَیْهِ] یعنی اس پر جھوٹ بولا یا اس پر افترا کیا۔ گویا ملک سلیمان کی طرف جھوٹ باتیں منسوب کر کے ان کا

الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ کیا(128) مگر شیطان کفر کرتے ہیں ۔(جو) لوگوں

کلام الٰہی ہونا ظاہر کرتے تھے۔

﴿مُلْكِ﴾ ملک اور جتنے مادے ان حروف کو مقلوب کر کے بنتے ہیں ان سب میں قوت اور شدت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ (ت) اور ملک اصل میں حکم کے ساتھ کسی چیز کا ضبط ہے جس میں تصرف حاصل ہو اور عام معنی اس کے بادشاہت ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے جیسا کہ ﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ کی تفسیر میں مجاہد سے ملک کے معنی نبوت مروی ہیں۔حضرت سلیمان کا اصل ملک یہی نبوت ہی تھی۔

**سلیمان ابن داؤد علیہما السلام:**

ان کا زمانہ حضرت مسیح سے 977 سال پیشتر ہے اور بنی اسرائیل میں شان وشوکت کے لحاظ سے اور وسعت مملکت کے لحاظ سے ان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔آپ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔

**سلیمان علیہ السلام پر یہودیوں کا افترا:**

یہ بتا کر کہ محمد ﷺ کے ظہور پر یہودیوں نے کس طرح کتاب اللہ کو پس پشت پھینک دیا۔اب بتاتا ہے کہ بجائے کتاب اللہ کی پیروی کے یہ لوگ ان جھوٹی باتوں کے پیچھے لگ گئے ہیں جو شریر اور مفسد لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام پر افترا کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور ان باتوں کے ذریعہ سے حق کو مٹانا چاہتے ہیں۔بہت ہی جھوٹی باتیں یہودی سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے جن میں سے کچھ مسلمانوں نے بھی لے کر سحر سلیمانی اور نقش سلیمانی بنا لیے ہیں۔شیاطین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اس قسم کی باتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔

128- **سلیمانؑ کی طرف کفر وشرک کی نسبت بائبل میں:** یہ اس لیے فرمایا کہ یہودیوں کی بعض اقوام کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس قدر بغض ہو گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان علیہ السلام کی طرف کفر وشرک کو منسوب کر دیا یہاں تک کہ یہ باتیں بائبل میں بھی داخل ہو گئیں۔ چنانچہ [اسلاطین: 11:4] میں ہے:''جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔'' پھر آگے آتا ہے کہ ''سلیمان کا دل خداوند سے برگشتہ ہو گیا اور خداوند اس پر غضبناک ہوا۔''

**بائبل کی تحریف اور قرآن کریم کا اس کی اصلاح کرنا:**

یہ اگر ایک طرف بائبل میں تحریف کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک نبی کی طرف ایسی بیہودہ باتوں کو منسوب کیا ہے تو دوسری طرف قرآن کریم کے ان کتابوں پر محافظ ہونے کا ثبوت ہے کہ ان کی غلطی کو ظاہر کر دیا۔آج عیسائی محققین بھی اسی بات کے معترف ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے۔چنانچہ انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں ہے:

السِّحْرَ ۗ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا

کو سحر سکھاتے ہیں(129) اور وہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نہیں اتارا گیا(130) اور نہ وہ دونوں کسی کو سکھاتے تھے یہاں تک کہ کہتے ہم صرف فتنہ ہیں

''غالباً یہ توضیح ہے کہ سلیمان کی بہت سی بیبیاں تھیں جن میں سے کچھ اسرائیلی قوم کی اور کچھ غیر اسرائیلی تھیں مگر اس نے ان سب کے لیے قربان گاہ نہیں بنائے تھے نہ ہی اس نے ان بیبیوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملانے کا کبھی ارتکاب کیا۔''

قرآن کریم کی صداقت کی کیسی عظمت نظر آتی ہے کہ جو بات تیرہ سو سال پیشتر بغیر بائبل کو پڑھنے کے ایک امی کے منہ سے نکلی، آج تحقیق کے بعد وہی درست ثابت ہوتی ہے اور بائبل کا اپنا بیان غلط ثابت ہوتا ہے۔ پس قرآن بائبل سے نقل نہیں کرتا بلکہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔

129- ﴿السِّحْرَ﴾ [اَلسِّحْرُ اَلْخِدَاعُ وَتَخْيِيْلَاتٌ لَاحَقِيْقَةَ لَهَا] (غ) سحر ان دھوکے کی باتوں اور تخیلات کو کہتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ اور جوہری کا قول ہے: [كُلُّ مَا لَطُفَ وَدَقَّ مَاخُذُهٗ فَهُوَ سِحْرٌ] (ت) وہ امر جس کی اصل دقیق اور لطیف ہو وہ سحر ہے اور حدیث میں ہے [إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا] (صحيح البخاري، كتاب الطب، باب باب مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا: 5767) یعنی بعض بیان سحر کا حکم رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پس شیطانوں کے لوگوں کو سحر سکھانے سے دھوکے کی باتیں اور تخیلات سکھانا مراد ہے جس کی اصلیت کچھ نہ تھی۔ جیسا کہ اب بھی بہتیرے شیطان ایسی باتیں لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں۔ سحر کے معنی جو قلب ماہیت عام لوگوں نے بنا رکھے ہیں اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

یہاں بتایا ہے کہ شیاطین یعنی شریر لوگ ایک تو حضرت سلیمان پر کچھ افترا کر کے لوگوں کو سناتے ہیں اور یہودی اس کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے یہ لوگ اس سحر کی پیروی کرتے ہیں جس کی تعلیم دینے والے بھی شریر لوگ ہیں۔ اس سحر کو وہ کس کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

130- ﴿بِبَابِلَ﴾ بابل ایک نہایت قدیم اور بہت بڑا شہر تھا جو مدت تک عراق عرب کا دارالخلافہ رہا۔ دریائے فرات پر واقع تھا جس کے دونوں طرف اب اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ مسیح سے 2300 سال پیشتر بھی یہ دارالخلافہ تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس کے گرداگرد کی فصیل 55 میل تھی۔ بخت النصر کے زمانہ میں بھی یہ عروج پر تھا بعد میں تباہ ہوگیا۔

﴿وَمَآ اُنْزِلَ﴾ میں ما نافیہ ہے ابن جریر نے اس معنی کی روایت کی ہے کیونکہ فرشتوں کو کبھی رسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا جاتا چہ جائیکہ ان پر سحر نازل ہو۔

تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ

پس کافر نہ بن (131) سو وہ ان دونوں (ذریعوں) سے وہ باتیں سیکھتے ہیں (132) جن سے مرد اور اس کی جورو کے

## ہاروت ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا:

یہودیوں کے تعلقات ایرانیوں سے بھی تھے جن کو وہ اب اسلام کے خلاف اکسا بھی رہے تھے۔ اور ایرانیوں سے ہی انہوں نے ہاروت ماروت کا قصہ لیا تھا۔ جن میں یہ مشہور تھا جیسا کہ سیل نے لکھا ہے کہ بابل میں ہاروت ماروت نام دو فرشتوں پر کچھ نازل ہوا تھا اور کہ وہ لوگوں کو کچھ سحر کی باتیں سکھاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی باتوں کی نفی کی ہے۔ ایک ان کی جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ دوسرے ہاروت ماروت کے قصہ کی اور ان پر سحر نازل ہونے کی اور جس طرح پہلے سلیمان کی طرف منسوب شدہ باتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ سلیمان نے کفر نہیں کیا۔ یہاں سحر کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ یہودی یہ کہہ کر اس کا اتباع کرتے ہیں کہ یہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اترا تھا۔ اس کی نفی کی ہے کہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر سحر اتارا گیا ہو۔

## ہاروت ماروت کے قصے پر محققین اسلام کے خیالات:

ہاروت ماروت کے جس قدر بے سروپا قصے بعض مفسرین نے لکھ دیئے ہیں ان کی اصل یا مجوسیوں میں کچھ ملتی ہے یا یہودیوں میں۔ قرآن و حدیث ان خرافات سے پاک ہیں۔ امام رازی نے ان قصوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت فاسد اور مردود ہے۔ شہاب عراقی نے کہا ہے کہ جو شخص ان باتوں کو مانتا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو زہرہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے وہ اللہ کا کافر ہے کیونکہ ملائکہ معصوم ہیں وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ روح المعانی میں ہے کہ ان قصوں میں سے رسول اللہ ﷺ سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ اے کاش اسلام کی کتابوں میں ان خرافات میں سے کچھ نہ ہوتا جن کو کوئی عاقل قبول نہیں کر سکتا۔ غرض یہ قصے اہل علم کے نزدیک مردود ہیں۔

131 - ہاروت ماروت کا قصہ بنانے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرشتے جو اوندھے منہ بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ مگر پہلے یہ کہہ لیتے ہیں کہ ہم ایک آزمائش ہیں۔ پس ہم سے جادو نہ سیکھو۔ اس سارے بے سروپا قصے کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ وہ کچھ سکھاتے ہی نہیں جو یہ کہنے کی نوبت آئے کہ ہم فتنہ ہیں تم ہم سے جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ قرآن شریف نے سحر کا سیکھنا سکھانا شیاطین کا کام بیان فرمایا ہے۔ مسلمانوں کو ان خرافات سے بچنا چاہیے۔

132 - ﴿مِنْهُمَا﴾ میں ضمیر ان دونوں ذریعوں کی طرف جاتی ہے جن کا ذکر اوپر ہے یعنی ایک وہ کفر کی باتیں جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں حالانکہ سلیمان کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور دوسرے وہ سحر جس کا بابل میں ہاروت و ماروت پر نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ

درمیان تفریق کرتے ہیں (133) اور اس سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں ہوں گے سوائے اس اور اگر وہ ایمان کے جو اللہ کے حکم سے ہو (134) اور وہ باتیں سیکھتے ہیں جو انہیں ضرر دیتی ہیں اور انہیں نفع نہیں دیتیں اور یقیناً وہ جانتے ہیں کہ جس نے اس کو مول لیا اس کا آخرت میں کوئی

---

133- **فری میسنری:** اس ایک فقرہ میں اس کل منصوبہ کی اصلیت کو بیان کر دیا ہے جو آنحضرت ﷺ کے خلاف کیا جاتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی برنگ مذہب ایسی ہے جس نے مرد اور عورت میں تفرقہ کیا ہے یعنی مردوں کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے مگر عورتوں کو نہیں اور یہ فری میسنوں کا طریق ہے۔ پس یہاں بتا دیا کہ فری میسن یعنی خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی طرف اگلے الفاظ میں اشارہ ہے۔ اور یہودی فری میسنوں سے مل کر خفیہ منصوبے آنحضرت ﷺ کے خلاف کر رہے ہیں۔

134- **اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے:** یہاں یہ بتایا کہ ان کی غرض اسلام کو اور آنحضرت ﷺ کو نقصان پہنچانا ہے مگر وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ اہل کتاب خفیہ منصوبے مومنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کرتے ہیں: ﴿اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [المجادلة: 58:10] خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں جن کی غرض یہ ہے کہ وہ یعنی شیطان مومنوں کو غم میں ڈالے اور وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں اللہ کے اذن سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ پہنچے گا۔ سو دونوں جگہ لفظ قریباً ایک ہی ہیں۔ پس درحقیقت ان الفاظ میں بھی انہی خفیہ منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو فری میسنوں کے ساتھ مل کر یہود آنحضرت ﷺ کو ہلاک کرنے کے لیے کر رہے تھے۔

## فری میسنری کی اصلیت:

فری میسن ایک سوسائٹی ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے حالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے نہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی تعلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں اس سوسائٹی کی باگ ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جن کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل ہے اور اس کی آخری منزل عیسائیت ہے۔ بعض بھولے بھالے مسلمان بھی اس جال میں پھنس کر اپنے دین و ایمان کو تباہ کر لیتے ہیں۔

یہاں چار باتیں بتا دی ہیں۔

① اول یہ کہ کچھ خفیہ منصوبے ہیں جو شیطان صفت لوگ کر رہے ہیں۔

② دوسرا یہ کہ وہ ان باتوں کا جواز اس طرح کرتے ہیں کہ انبیاء (سلیمان علیہ السلام) اور ملائکہ (ہاروت ماروت) کی طرف ان کو منسوب

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٢ | حصہ نہیں (135) اور کیا ہی برا ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا، کاش وہ جانتے۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٣ ع | لاتے اور تقویٰ کرتے، اللہ کی طرف سے بدلہ بہتر تھا، کاش وہ جانتے۔ (136)

ع 12 7 12

---

کرتے ہیں۔

③ تیسرا یہ کہ یہ منصوبے ان لوگوں کے ہیں جو مرد اور عورت میں تفرقہ کرتے ہیں۔ یعنی فری میسن۔

④ چہارم یہ کہ ان کی غرض اسلام کو تباہ کرنا ہے مگر وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

## مومنوں کو تکلیف پہنچنے کی وجہ:

﴿اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اِلَّا یہاں استثنائے منقطع کے طور پر ہے یعنی اس سے ایک نیا کلام شروع ہوتا ہے یعنی وہ تو تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے ہاں اللہ کے اذن سے کچھ تکلیف مومنوں کو بھی پہنچ جائے گی۔ اور یہاں اس قسم کے استثناء کی ضرورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کو بھی کچھ نہ کچھ تکلیفیں، کچھ خوف، کچھ بھوک، کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی ضرور ہے کہ پہنچیں۔ کیونکہ بغیر تکالیف کے مومن کمال کو حاصل نہیں کر سکتے۔ [155] پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جو تکلیف یہ دشمن پہنچانا چاہتے ہیں اور وہ منصوبہ ہلاکت ہے وہ تو یہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں مومنوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کے لیے جو علم الٰہی میں بعض تکالیف کا پہنچنا ضروری ہے وہ پہنچیں گی۔

135 - ﴿خَلَاقٍ﴾ خَلَقَ پیدا کرنا ہے۔ یعنی ظاہری بناوٹ اور خُلُقٌ خصائل سے تعلق رکھتا ہے گویا وہ اندرونی بناوٹ ہے اور خَلَاقٌ وہ فضیلت ہے جو انسان اپنے خلق سے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی حظ یا حصہ ہو گئے ہیں۔ (غ)

## منصوبہ کرنے والوں کا انجام:

یہاں یہ بتا دیا کہ نہ صرف وہ آنحضرت ﷺ کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ یہ باتیں خود ان کے نقصان کا موجب ہوں گی وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ نقصان ہی اٹھائیں گے۔ چنانچہ ایسا واقعہ ہی ہوا کہ یہ اسلام کے خلاف منصوبے آخر ان کی تباہی اور جلاوطنی کا موجب ہوئے۔

136 - ﴿لَمَثُوْبَةٌ﴾ مَثُوْبَةٌ اور ثَوَابٌ دونوں ثَوْبٌ سے ہیں جس کے معنی ہیں کس چیز کا اس اصل حالت کی طرف رجوع کرنا جس پر وہ تھی اور مَثُوْبَةٌ یا ثَوَابٌ کسی عمل کی جزا کو اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہی عمل ہی واپس آ گیا۔ (غ)

اس آیت میں قرآن شریف پر ایمان کو پیش کیا اور اس طرح سے آخر رکوع کا تعلق اگلے رکوع سے کیا جس میں قرآن شریف کی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! راعنا نہ کہو اور انظرنا کہو اور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (137)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ

اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا

---

عظمت کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ پہلی شرائع اس سے منسوخ ہوئیں اس لیے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

137- ﴿رَاعِنَا﴾ رَاعٍ۔ رَعْی سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنا ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: [كُلُّكُمْ رَاعٍ] (صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الْجُمُعَةِ فِي الْقُرَى وَالْمُدْنِ: 893) پس ﴿رَاعِنَا﴾ کے معنی ہیں ہماری بات سنیے۔

﴿اُنْظُرْنَا﴾ نظر آنکھ کے پھیرنے کا نام ہے کسی چیز کے دیکھنے کے لیے۔ کبھی اس سے غور اور تحقیق مراد ہوتی ہے۔ اور نظر کے معنی انتظار کرنا بھی آتے ہیں۔ (غ) یہاں اُنْظُرْنَا کے معنی ہیں ہمارا انتظار کیجیے یا ہمیں مہلت دیجیے تاکہ ہم آپ کی بات سمجھ لیں۔

### یہودیوں کی شرارتیں:

رَاعِنَا کہنے کی ممانعت کی وجہ دوسری جگہ یوں دی ہے کہ یہودی کہتے ہیں: ﴿رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ﴾ [النسآء: 46:4] رَاعِنَا کا لفظ اپنی زبانیں مروڑ کر بولتے ہیں یعنی رَاعِنَا کی بجائے رَعْنَ کہہ دیتے ہیں اور یہ لفظ رَعُوْنَتٌ سے ہے جس کے معنی جہالت و حماقت ہیں۔ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ ادنی قسم کی ایک شرارت تھی کہ بات بات میں استہزاء کرتے تھے اور پھر فخر کرتے تھے کہ دیکھو ہم انہیں کیسا بناتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس لفظ سے اس لیے روکا کہ گو ان کا منشاء برا نہ ہو مگر یہودی اس قسم کی باتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور یوں بتایا کہ ان باتوں سے بھی اجتناب ضروری ہے جن کا گو منشا برا نہ ہو مگر نتیجہ برا ہو۔

### یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی:

مضمون کا تعلق پہلے مضمون سے ظاہر ہے وہاں بھی یہودیوں کی کچھ شرارتوں کا ذکر تھا مگر وہ ایسی شرارتیں تھیں جو خفیہ طور پر منصوبوں کے رنگ میں اسلام کو تباہ کرنے کے لیے وہ کرتے تھے۔ یہاں ان کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر ہے جو معمولی بول چال میں وہ استہزا کے رنگ میں کرتے تھے۔ ان کا اس طرح استہزا کرنا صاف بتاتا ہے کہ ان کے اندر نیک نیتی کوئی نہ تھی۔ مخالفت بعض وقت انسان نیک نیتی سے بھی کر بیٹھتا ہے مگر یہودیوں کی مخالفت بر بنائے شرارت تھی اور یہی ان کے منصوبوں استہزا کا ذکر کرنے سے مقصود ہے۔

بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵
ہے۔اوراللہ بڑے فضل والا ہے۔(137)

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۶
جو پیغام ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے فراموش کرادیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں (138) کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

---

137-﴿يَوَدُّ﴾ وَدَّ کسی چیز کی محبت رکھنا اور اس کے ہونے کی خواہش کرنا اور دونوں معنوں میں ہر ایک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

﴿اَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ اَهْلٌ کسی شخص کے وہ ہیں جن میں اور اس میں ایک اتحاد یا جمعیت کا رنگ ہو بوجہ نسب کے یا دین کے یا اور کسی چیز کے جو ان دونوں کے قائمقام ہو جیسے صنعت یا گھر یا شہر۔(غ) پس ﴿اَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہوئے جو ایک کتاب پر مجتمع ہیں اس لیے چونکہ کتاب کا لفظ بعض وقت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی پر بولا گیا ہے اور بعض وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وحی پر اور بعض وقت کل انبیاء علیہم السلام کی وحی پر۔ تو اہل کتاب سے مراد کبھی صرف یہود، کبھی صرف نصاریٰ، کبھی یہود و نصاریٰ دونوں ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جس طرح کتاب میں بعض وقت عمومیت ہوتی ہے اسی طرح اہل کتاب میں بھی عمومیت مراد ہو سکتی ہے۔

﴿خَيْرٌ﴾ خَيْرٌ اصل میں وہ چیز ہے جس میں سب لوگ رغبت کریں۔(غ) یہاں مراد وحی الٰہی ہے۔(ر)

﴿رَحْمَتُهٗ﴾ رَحْمَةٌ رقت ہے جس کا اقتضا مرحوم پر احسان ہو اور کبھی اس کا استعمال صرف رقت پر ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت صرف انعام و افضال کا نام ہے۔(غ)

﴿الْفَضْلِ﴾ فَضْلٌ۔ اقتصاد یعنی درمیانہ حالت سے زیادہ کا نام ہے۔ مگر جہاں محل ذم ہو وہاں فضول کہا جاتا ہے اور فضل کا اکثر استعمال محل مدح میں ہے اور ہر ایک عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں فضل کہلاتا ہے۔(غ) اور یہاں مراد ایسا ہی فضل ہے گو بعض وقت ان چیزوں پر اس کا استعمال ہوجاتا ہے جو بذریعہ اکتساب حاصل ہوتی ہیں جیسے مال و جاہ و قوت۔(غ)

یہاں الفاظ خیر اور رحمت اور فضل سب میں اس وحی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔

138-﴿نَنْسَخْ﴾ نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کرنا۔ اس لیے یہ لفظ لکھنے یا اثبات کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور صرف ازالہ کے معنی میں بھی اور ایک چیز کا ازالہ کرکے دوسرے کا اثبات کرنے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی ایک حکم کا دوسرے حکم سے ازالہ کرنا جو اس کے پیچھے آتا ہے۔(غ) اور نسخ کتاب صرف کتاب لکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن شریف میں اس معنی میں اِسْتِنْسَاخٌ بجائے نَسْخٌ کے آیا ہے جیسے: ﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کی

﴿كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾[الجاثية: 29:45] ’’ہم لکھ لیتے تھے، جو کچھ تم عمل کرتے تھے۔‘‘ اور نُسْخَةٌ بمعنی تحریر ہے: ﴿وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى﴾[الأعراف: 154:7] ’’اور ان کی تحریر میں ہدایت ہے۔‘‘

﴿اٰيَةٍ﴾ کے مشہور معنی [اَلْعَلَامَةُ الظَّاهِرَةُ] یعنی ظاہر نشان ہیں۔مگر تاج العروس میں ہے: [اَلْاٰيَةُ، اَلرِّسَالَةُ، وَتُسْتَعْمَلُ بِمَعْنَى الدَّلِيْلِ وَالْمُعْجِزَةِ] یعنی اٰيَةٌ کے معنی رسالت یا پیغام الٰہی ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر کے بعد آتا ہے: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾[البقرة: 38:2] میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی۔ پس جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ حزن ہوگا۔اور اس کے مقابل پر ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کریں اور انہیں جھٹلائیں۔ یہاں صاف طور پر آیات کے معنی الٰہی پیغام ہیں۔ ایسا ہی [یس: 46:36] میں ہے: ﴿وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ﴾ ’’کوئی آیت ان کے رب کی آیات میں سے ان کے پاس نہیں آتی مگر اس سے اعراض کرتے ہیں۔‘‘ جہاں آیات کے معنی روح المعانی میں ہیں: [اَلْكُتُبُ الْمُنْزِلَةُ] یعنی وہ کتابیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئیں۔ یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں۔

## یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی:

یہاں نسخ آیات یا ان کے فراموش کرا دینے سے کیا مراد ہے؟ سیاق مضمون یوں ہے کہ یہودی قرآن پر ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ یہ بنی اسرائیل پر نازل نہیں ہوا۔اگر موعود نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو شریعت موسوی کلیۃً منسوخ نہ ہوتی۔ اسی بات کا جواب قرآن کریم نے یہاں دیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کہ یہ اہل کتاب تم پر (یعنی مسلمانوں یا بنی اسماعیل پر) وحی الٰہی کا آنا پسند نہیں کرتے۔

## یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کی مثل ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا یا فراموش کرا دیا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل شریعت ہم نے تم کو دے دی ہے۔بہتر یا مثل اس لیے کہا کہ بعض احکام تو وہی رہتے ہیں لیکن اس کی تعلیم کا اکثر حصہ شریعت موسوی سے بہتر ہے وہ ایک قوم کے لیے تھی یہ کل قوموں کے لیے ہے۔ وہ ایک زمانہ کے لیے تھی یہ کل زمانوں کے لیے ہے۔ ایسا ہی بہت سی باریک باتیں ابتدائی زمانہ کے لحاظ سے پہلے ظاہر نہ کی گئی تھیں اب جب عقل انسانی میں پختگی بڑھ گئی تو زیادہ باریک باتیں نازل کی گئیں۔ ﴿بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ کی ایک توجیہ یوں بھی ہوسکتی ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے تو یہ شریعت موسوی شریعت سے افضل ہے مگر پیشگوئی میں بلحاظ ایک نئی شریعت ہونے کے اسے مثل بھی کہا گیا ہے جیسا کہ [استثنآء: 18:18] والی پیشگوئی ہے۔

الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ ہی ہے؟ اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں اور

**وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآنی کا:**

سیاق وسباق کے لحاظ سے ان معنوں کی صحت پر کچھ شک نہیں ہوسکتا۔مگر مفسرین نے اس آیت سے قرآن کریم کی بعض آیات کا بعض سے منسوخ ہونا مراد لے لیا ہے جو بالکل بے تعلق مضمون ہے۔ یہاں نہ پہلے نہ پیچھے کوئی ایسی آیت ہے جو دوسری سے منسوخ ہوئی ہو یا دوسری کی ناسخ ہو بلکہ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک کسی ایسی آیت کے نازل ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔جس نے کسی پہلی نازل شدہ آیت کو منسوخ کر دیا ہو۔ پس جب یہ جھگڑا ہی اب تک پیش نہیں آیا، جب کسی کا اعتراض کرنا ہی ممکن نہ تھا تو یہاں نسخ آیات قرآنی کے مضمون کو بیان کرنا بالکل بے معنی بات ہے۔ یہ دوسری قطعی دلیل اس بات پر ہے کہ یہاں نسخ آیات قرآنی کا ذکر نہیں بلکہ نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے۔

**قرآن کریم کا معجزہ کہ آنحضرت ﷺ کبھی اسے بھولے نہیں:**

تیسری قطعی دلیل یہ ہے کہ یہاں نسخ کے ساتھ فراموش کرادینے کا ذکر ہے۔لیکن قرآن کریم کے متعلق قطعی طور پر فرمایا: ﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى﴾ [الأعلىٰ: 6:87] ''ہم جو کچھ تجھ کو پڑھائیں گے تو اسے نہیں بھولے گا۔'' اور اس کے آگے جو یہ فرمایا: ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ ''مگر جو اللہ چاہے۔'' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کچھ حصہ بھول بھی جاؤ گے۔کیونکہ اس طرح عبارت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر بھول جائے گا۔یوں کوئی معمولی آدمی بھی گفتگو نہیں کر سکتا چہ جائیکہ قرآن جیسی پر حکمت کتاب کی طرف یہ بات منسوب ہو۔ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ کے معنی صاف ہیں کہ اور بعض باتیں تو تم بھول بھی جاتے ہو۔مگر ہمارے پڑھانے کا یہ اثر ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے اسے ہرگز نہ بھولو گے۔اور امر واقع بھی یوں ہی ہے نبی کریم ﷺ پر بیس بیس رکوع کی سورت ایک وقت نازل ہوئی ہے اور آپ کو کبھی اس کا ایک لفظ نہیں بھولا۔ پھر بفرض محال اگر آنحضرت ﷺ بھول جائیں تو ساتھ ساتھ جو لوگ حفظ کرتے چلے جاتے تھے اور جن کی تعداد گو پہلے تھوڑی تھی مگر اب مدینہ آکر سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی وہ سب کے سب کس طرح بھول جاتے اور ایک بھولتا تو دوسرا فوراً اسے درست کر دیتا۔جس طرح آج بھی جب ایک حافظ قرآن ایک لفظ کو غلط پڑھتا ہے تو دوسرا اس کے پیچھے درست کرنے کو کھڑا ہوتا ہے۔پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف ہر ایک آیت حفظ ہی کی جاتی ہے بلکہ لکھی بھی جاتی ہے۔اس تحریر کو کون محو کر دیتا تھا نہ اس کے محو کرنے کا یہاں کوئی ذکر ہے۔ یہاں صرف فراموش کرانے کا ذکر ہے۔ ہاں فراموش پہلی شرائع کی بعض باتیں ہوگئیں جو مرور زمانہ سے بالکل دنیا سے نابود ہوگئیں۔پس اس لحاظ سے بھی نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآنی کا۔

**نسخ کی کوئی روایت آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچتی:**

رہا یہ سوال کہ قرآن کریم کی کوئی آیت جو اس وقت بین الدفتین موجود ہے آیا وہ منسوخ ہے؟ کچھ روایت ضرور ایسی ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی روایت نبی کریم ﷺ تک نہیں پہنچتی۔یعنی کسی روایت میں یہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کسی

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۱۰۷ نہ کوئی مددگار ہے۔(139)

آیت کومنسوخ فرمایا۔حالانکہ اگرنسخ آیات قرآنی کا مسئلہ درست ہوتا توکوئی نہ کوئی روایت نبی کریم ﷺ تک بھی پہنچ جاتی۔

## صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں:

پس جب خود نبی کریم ﷺ کسی آیت کومنسوخ قرار نہیں دیتے اور ہر آیت کا قابل عمل ہونا خود رسول اللہ ﷺ کے منہ سے ثابت ہے تومحض کسی صحابی کے قول سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہوسکتی۔صحابی کا قول تو ویسے بھی حجت نہیں چہ جائیکہ آیات قرآنی کے بارہ میں جوقرآن شریف میں موجود ہے کسی آیت کومحض ایک صحابی کے قول کی وجہ سے منسوخ مانا جائے۔

## روایات نسخ میں ایک دوسرے کی تردید:

دوسری بات روایات نسخ کے متعلق یادرکھنے کے قابل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں اکثر ان روایات کی یہ حالت ہے کہ جہاں ایک صحابی کی رائے ایک آیت کے منسوخ ہونے کے متعلق ہے وہیں دوسرے صحابی کی رائے اس کے غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے۔پس معلوم ہوا کہ خود روایات ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں۔پس نسخ کا مسئلہ اور بھی کمزور ہوجاتا ہے۔

## روایات نسخ ضعیف ہیں:

تیسری بات یہ ہے کہ ایسی کل روایات ضعیف ہیں۔چنانچہ طبرسی کا قول ہے: [اَلرِّوَايَاتُ فِى النَّسْخِ كُلُّهَا ضَعِيْفَةٌ]۔

## تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف:

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض نے صرف پانچ آیات کومنسوخ کہا اور بعض نے کئی سو آیات کومنسوخ کہہ دیا ہے۔اس قدر اختلاف بتاتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کی بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب ایک شخص ایک آیت کو دوسری کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکا تو اس نے اسے منسوخ کہہ دیا۔

## اختلاف قبول کرکے منسوخ کہنا قرآن کے خلاف ہے:

یہ بھی نہیں سوچا کہ آیا فی الواقع جسے منسوخ کہہ دیا ہے وہ پہلے کی نازل شدہ ہے بھی یا نہیں۔اور تطبیق دینے کی بجائے منسوخ کہنا گویا قرآن کریم میں اختلاف قبول کرنا ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے:

﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النسآء: 82:4] ''اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔'' پس اگر قرآن کریم میں اختلاف قبول کیا جائے تو وہ من عند اللہ نہیں اور اگر اختلاف نہیں تو نسخ کی ضرورت نہیں۔یہ اپنے اپنے موقع پر دکھایا جائے گا کہ جہاں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے نسخ مانا گیا ہے وہاں تطبیق دی جاسکتی ہے۔پس نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ بالکل باطل ہے اور یہاں سابقہ شرائع کے نسخ کا ذکر ہے۔

139 - یہاں مُلْكُ کے لفظ میں نبوت دینے کی طرف اشارہ ہے [دیکھو نمبر: 127]۔دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

بلکہ تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو، جس طرح پہلے موسیٰ سے سوال کیا گیا تھا اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لے لیتا ہے وہ ضرور سیدھے رستے سے بھٹک گیا ہے۔ (140)

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

الثّلٰثة

اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا، سو معاف کرو اور خیال میں نہ لاؤ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (141)

---

الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴾[النسآء: 54:4] یعنی اب بھی ہم نے آل ابراہیم (محمد رسول اللہ ﷺ) کو ہی کتاب اور حکمت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کو بڑا ملک دیا ہے۔ ''تُو'' میں ہر مخاطب مراد ہے جیسا کہ ضمیر جمع نے بعد میں آ کر صاف کر دیا۔

140- **یہودیوں کے گستاخانہ سوالات:** یہاں یہودی مخاطب ہیں۔ رَسُوْلَكُمْ سے مراد وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ ایسے گستاخانہ سوال یہودی ہی کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ صاف فرمایا: ﴿يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ ﴾[النسآء: 153:4] اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب اتارے، سو موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا۔ ایمان کے بدلے کفر لینے سے مراد یہی ہے کہ ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے جیسا کہ یہودیوں نے کیا۔

141- ﴿حَسَدًا﴾ حَسَدٌ یہ ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت کے زوال کی خواہش کی جائے جس نعمت کا وہ مستحق ہے اور بسا اوقات اس میں اس کے دور کرنے کی بھی کوشش ہوتی ہے۔ (غ) اور جو دوسرے جیسی نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ غبطہ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ [اَلْمُؤْمِنُ يَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ يَحْسُدُ] (المفرادات، جلد 1، صفحہ118) یعنی مومن غبط کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ حسد یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال چاہتا ہوا اس کے خود حاصل کرنے کی خواہش کرے اور غبط یہ ہے کہ صرف یہ خواہش کرے کہ اسے بھی دوسرے جیسی نعمت مل جائے اور دوسرے سے زوال کی

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو کوئی بھلائی اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے، اللہ اسے دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (142)

---

خواہش نہ کرے۔ اور حدیث میں جو آتا ہے: [لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ] [صحيح البخاري، كتاب العلم، باب الاغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ: 73] تو اس کے معنی کیے ہیں کہ کوئی حسد نہیں جو نقصان نہ پہنچائے مگر دو باتوں میں۔ مگر یہاں حسد کا استعمال غبط کے معنی میں ہے۔

﴿اصْفَحُوْا﴾ صَفْحٌ کے معنی ہیں ترک ملامت کرنا اور یہ عفو سے بڑھ کر ہے۔ (غ)

### یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا:

یہاں بتایا کہ یہ یہود بھی گمراہ ہوتے ہوتے اس حد تک پہنچے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان حالت کفر کی طرف لوٹ جائیں۔ یہ محض حسد ہے ورنہ کم از کم توحید کے مذہب کو بت پرستی سے تو اچھا سمجھتے۔ دوسری جگہ اہل کتاب کا قول کفار کے متعلق نقل کیا ہے: ﴿هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا﴾ [النسآء: 51:4] ''یہ مومنوں سے زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔'' کفار قریش اور یہود کی اسلام کی بیخ کنی کے لیے غرض واحد تھی۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان دین اسلام پر نہ رہیں اور اسی غرض کے لیے جنگ کرتے تھے: ﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ [البقرة: 217:2] ''اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو۔''

### جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل:

اللہ کے اپنا امر یا حکم لانے سے منشا یہ ہے کہ اسلام کی بادشاہت قائم ہو جائے۔ فرمایا اس سے پہلے یہ تو نہیں ٹلیں گے۔ پس تم ہی عفو و درگزر سے کام لو۔ مسلمانوں کا جنگ کرنا صرف اپنی حفاظت کے لیے اور اسلام کی حفاظت کے لیے تھا انتقام کے طور پر کبھی جنگ نہیں کی۔ عین جنگ کے اندر پھر فتح کے بعد اسی تعلیم عفو و درگزر پر عمل رہا۔ فتح مکہ کے بعد ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ [يوسف: 92:12] ''آج تم پر کچھ الزام نہیں۔'' اسی حکم کی تعمیل میں فرمایا۔ پس اس آیت کو منسوخ کہنا صریح غلطی ہے۔

142 - **نماز بطور علاج:** کیا اس سے پہلے مسلمان نماز نہ پڑھتے تھے؟ کسی حکم کے دینے کا منشا لازماً یہ نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے اس کے خلاف ہو رہا تھا۔ یہاں اوپر کی آیت میں مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کیا کہ اہل کتاب اس قدر دشمن ہو رہے ہیں کہ اسلام سے ہی برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان مشکلات کا علاج یہاں بتایا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ مصیبت میں نماز بہترین علاج ہے۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر صرف نماز سے انسان اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتا، جب تک زکوٰۃ کی صورت میں ہمدردئ مخلوق ساتھ نہ ہو۔ آخر پر فرمایا کہ نماز پڑھ کر تم خدا کا کچھ نہیں بناتے اپنی ہی جان کی بھلائی کے لیے کچھ

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور کہتے ہیں کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے ان کے جو یہودی ہوں یا عیسائی، یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو۔ (143)

بَلٰى ۗ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ؑ

ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ کا فرمانبردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (144)

13 ع 9 13

---

کام کرتے ہو جس کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ضائع کچھ نہیں ہوتا، اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

143 - ﴿بُرْهَانَكُمْ﴾ بُرْهَانٌ۔ بَرِهَ (روشن ہوا) سے بُرْهَانٌ وہ دلیل ہے جو دعویٰ کو روشن کردے جو نہایت مضبوط اور لامحالہ سچی ہو۔ (غ)

﴿اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ هُوْدٌ جمع هَائِدٌ ہے اور هَادَ کے لیے [دیکھو نمبر: 92]۔ قَالُوْا میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں اور یہ اصل میں دو جملوں کا اختصار کر کے ایک کر دیا ہے یعنی یہودی کہتے تھے کہ یہودیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عیسائی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ جیسا کہ آیت [نمبر: 113] سے ظاہر ہے ان کے اسی قول کو اَمَانِيُّ یعنی آرزو یا دعویٰ باطل قرار دیا ہے اور ان سے دلیل مانگی ہے۔ یہودی کہتے تھے کہ بغیر شریعت موسوی کے نجات نہیں۔ عیسائی کہتے تھے بغیر کفارہ کے نجات نہیں۔ مگر کوئی دعویٰ بلا دلیل قبول نہیں ہوسکتا۔

**قرآن دعویٰ کی دلیل دیتا ہے:**

دونوں کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔ اس لیے عیسائیوں نے تو آخر مذہب ہی یہ بنالیا کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ یہودی بھی محض کورانہ تقلید کے طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں۔ دونوں کے خلاف اسلام روشن دلائل سے کام لیتا ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام ہر دعویٰ کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔

144 - ﴿اَسْلَمَ﴾ سَلْمٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا اور اسلام کے معنی ہیں سلامتی میں داخل ہونا اور [أَسْلَمْتُ الشَّيْءَ إِلٰى فُلَانٍ] کے معنی ہیں میں نے چیز دوسرے کو سونپ دی اور اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے۔ ایک محض زبان کے ساتھ اقرار کرنا اور یہ ایمان سے کمتر ہے مگر اس کے ساتھ اسلام کے ظاہری احکام جاری ہوجاتے ہیں جیسے: ﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا﴾ [الحجرات: 14:49] ''کہہ تم ایمان نہیں لائے، لیکن کہو ہم مسلمان ہوئے۔'' میں اور دوسرا یہ کہ اقرار لسان کے ساتھ دلی اعتقاد اور عمل کے ساتھ وفا یعنی اقرار کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو بکلی سپرد کر دینا بھی ہو۔ ان تمام باتوں میں جو اس کے قضا و قدر میں ہوں۔ (غ) یہی دوسرے معنی یہاں مراد ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ١ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ١ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ | اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی کسی (سچائی) پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودی کسی (سچائی) پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح اُنہی کے قول کی مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے سو اللہ ان کے درمیان |

﴿وَجۡهَهٗ﴾ وَجۡهٌ۔ منہ ہے۔ اور چونکہ وجہ پہلی چیز ہے جو سامنے آتی ہے اور ظاہر بدن میں سب سے اشرف چیز ہے اس لیے ہر سامنے آنے والی چیز پر اور ہر اشرف چیز پر اور اس کے آغاز پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات وجہ کہہ کر ذات یعنی خود وہ چیز مراد لی جاتی ہے اور اس کے معنی توجہ بھی ہیں۔ (غ)

### نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے:

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کے سوائے دوسرے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ جب آیت ماقبل میں اس کو دعویٰ بلا دلیل کہہ کر ردّ کر دیا تو اب یہ بتایا کہ مذہب دعویٰ کا نام نہیں بلکہ طریق عمل کا نام ہے۔ اور جنت میں وہی داخل ہوتا ہے جو اس طریق عمل کو اختیار کرتا ہے جو جنت تک پہنچانے والی ہے۔ منہ سے ایک یا دوسری بات کہہ دینا جنت میں نہیں پہنچاتا۔ اس میں ایک مسلمان کو تو یہ سمجھایا کہ نرا دعویٰ اسلام بھی جنت تک نہیں پہنچاتا جب تک وہ اس طریق عمل پر چلنے کے لیے پورا زور نہ لگائے جو اسلام نے بتایا ہے اور دوسرے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ طریق عمل جو خدا تک پہنچاتا تھا وہ تم میں باقی نہیں رہا۔

### طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے:

وہ طریق عمل کیا ہے؟ اپنی ساری توجہ کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا دینا۔ اپنے آپ کو بکلی خدا کو سونپ دینا۔ مگر نہ اس شخص کی طرح جو دنیا سے انقطاع کر لے۔ بلکہ خدا کی ایسی فرمانبرداری جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری ہو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری جو نفس انسانی کا اپنی ذات میں کمال ہے۔ اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری جو دوسروں کی تکمیل میں معاون ہونا ہے۔ یہ سچے مذہب کے دو ستون ہیں اور ان کو کمال تک صرف اسلام نے پہنچایا۔

### خوف وحُزن سے نجات:

اور آخر پر فرمایا کہ ﴿لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت جو آخرت میں ملتی ہے اس کی ابتدا اسی زندگی سے ہوتی ہے اور اس زندگی میں وہ جنت یہ ہے کہ انسان پر خوف نہ رہے، نہ وہ غمگین ہو۔ [جس کی تشریح کے لیے دیکھو نمبر: 59] یعنی وہ لوگ اللہ کی کامل فرمانبرداری جب کرتے ہیں تو شیطان بھی ان کا تابع ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے پھسلانے کا خوف ان کو باقی نہیں اور چونکہ ان کا وقت مخلوق خدا کی بہتری میں صرف ہوتا ہے اس لیے گزشتہ کے متعلق ان کو حزن بھی نہیں ہوتا۔ پس اس مقام پر پہنچ جانا یعنی ایک طرف گناہ کی غلامی سے آزاد ہونا اور شیطان کو فرمانبردار بنا لینا اور دوسری طرف مخلوق

قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔(145)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اس سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے ان کو مناسب نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔(146)

---

خدا کی بھلائی میں لگ جانا اس دنیا کی جنت ہے اور یہی آخرت کی جنت کی دلیل ہے۔

145- **ہر مذہب میں سچائی کے ہونے کی تعلیم:** جب اس بات کو بیان کیا کہ نجات کس طرح حاصل ہوتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کسی مذہب کے متعلق یہ نہ کہنا چاہیے کہ اس میں کوئی بھی سچائی نہیں۔ یہود و نصاریٰ ایک ہی کتاب بائبل کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر پھر بھی ضد میں آکر یہی کہتے ہیں کہ دوسرے فریق کے مذہب میں کچھ بھی صداقت نہیں۔ یہ جاہل لوگوں کا کام ہے کہ جب اپنے مذہب کی صداقت کو بیان کرنا شروع کیا تو دوسرے سب کو سراسر باطل اور تمام قسم کی خوبیوں سے خالی کہہ دیا۔ نجات کامل بے شک اسی میں ہے کہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جائے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان اس کی زندگی کا مقصد ہو۔ مگر تاہم کچھ نہ کچھ صداقت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔

**غلط عقائد پر اس دنیا میں گرفت نہیں:**

ہاں عقائد مذہبی کے اختلاف کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی کا عقیدہ ذرا غلط ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے فوراً ہلاک کر دے گا یا کسی کو دکھ میں مبتلا کر دے۔ جو کمی غلط عقائد کی وجہ سے رہ جاتی ہے اس کا کھلا ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا اور وہیں اس کے پورا کرنے کا سامان بھی ملے گا۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ جو لوگ عبادت گاہوں کو ویران کرتے اور خدا کی عبادت سے روکتے ہیں ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔

146- ﴿مَسٰجِدَ﴾ سَجْدَۃٌ کرنے کی جگہ یعنی عبادت گاہ کا نام ہے۔ (ت) بیت المقدس کو بھی مسجد ہی کہا ہے۔ مگر دوسری عبادت گاہوں کے بالمقابل خصوصیت سے یہ لفظ اسلام کی عبادت گاہ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے: ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ [الحج: 40:22] ''تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔''

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، پس جدھر تم متوجہ ہو گے

﴿خَرَابِهَا﴾ خَرَابٌ۔ عَمَارَةٌ یعنی آباد کرنے کی ضد ہے۔

﴿خِزْیٌ﴾ انکسار کا پہنچنا ہے خواہ اپنی طرف سے ہو یا غیر کی طرف سے۔(غ) پس محض روکنے میں آخر کار ناکامی بھی خِزْیٌ ہے اور دوسرے کا مغلوب ہو جانا بھی۔

## خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے:

پہلی آیت میں اختلاف عقائد کا ذکر کیا تھا کہ اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہو گا۔ یہاں فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں شرارت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ مسجدوں میں خدا کی عبادت کو روکنے لگ جاتے ہیں اور ان کو ویران کرتے ہیں ان کو سزا بھی دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے جس طرح ایک دوسرے کے مذہب کو ہر قسم کی خوبی سے عاری بتایا اسی طرح ایک دوسرے کو ان کی عبادت گاہوں سے بھی روکا اور ایک دوسرے کے ایسے دشمن ہو گئے کہ ہر فریق دوسرے کی بیخ کنی کے درپے رہا جب اس کو طاقت ملی۔ اسی لحاظ سے مسجدوں سے روکنے کا ذکر کیا۔ مگر اس کو نبی کریم ﷺ کے اعدا کی حالت پر چسپاں کر کے بطور پیشگوئی ان اعدا کی ناکامی کا ذکر کیا۔

## مساجد سے مراد مسجد حرام:

نبی کریم ﷺ کو اگر مشرکین نے مسجد حرام سے روکا (جس کی طرف لفظ مساجد میں اشارہ ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام دنیا کی مساجد کا مرکز ہے۔) تو یہود اور عیسائی بھی انہی کے معاون ہو گئے۔ اس لیے ان کا انجام بھی اس پیشگوئی میں مذکور ہے۔ اور جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا کہ کسی مذہب میں صداقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے یہاں یہ بتایا کہ تمام مذاہب کے پیرووں کو عبادت میں آزادی دینی چاہیے۔

## مسلمانوں کا مسلمانوں کو مساجد سے روکنا:

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تو کافر ہی مساجد سے روکتے تھے مگر آج تو مسلمان خود بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو مساجد سے روکتے ہیں اور ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقہ کے مسلمانوں کو اپنی مسجد میں آنے نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ذلت اٹھا رہے ہیں۔

## دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل:

یہاں دنیا کی سزا کو آخرت کی سزا کے لیے بطور پیش خیمہ اور ثبوت بیان فرمایا ہے۔ جس وقت یہ لفظ نازل ہوئے اس وقت دشمنانِ اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر ان کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ غیر متوقع امر صفائی سے پیش آیا اور یہودیوں اور دوسرے دشمنان اسلام کا چند ہی سال میں ذلیل ہو جانا قرآن شریف کی صداقت پر ایک بڑا بھاری نشان ٹھہرا۔

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ادھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوئی، اللہ فراخی والا جاننے والا ہے۔(147)

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا، وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے، سب اس کے فرمانبردار ہیں۔(148)

---

147- ﴿فَثَمَّ﴾ ثَمَّ۔ ظرف ہے اور اس سے دور کے مکان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

﴿وَاسِعٌ﴾ سَعَةٌ فراخی ہے خواہ بلحاظ مکان ہو یا بلحاظ حالت یا فعل اور وَاسِعٌ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے اور اس کی قدرت اور علم اور رحمت اور فضلوں کی فراخی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [الأعراف: 156:7] ''اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [الأنعام: 80:6] ''میرے رب کا علم تمام چیزوں کو لیے ہوئے ہے۔'' (غ)

## خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلی:

یہاں قبلہ کا ذکر سمجھ کر جس پر کوئی قرینہ نہیں بعض نے اسے قبلہ بیت المقدس کا ناسخ اور بعض نے ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ﴾ سے منسوخ بتایا ہے۔ مگر اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ چونکہ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ اگر ان کو خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی توجہ خانہ کعبہ پر محدود نہیں بلکہ اے مسلمانو! اگر تم مسلمان ہو تو جہاں جاؤ گے اللہ کی توجہ وہیں تمہارے ساتھ ہوگی اور دوسرے جس طرح پہلی آیت میں پیشگوئی کی تھی کہ مسجدوں سے روکنے والوں یعنی اعدائے اسلام کے لیے بالآخر ناکامی ہے۔

## بشارتِ فتوحات:

یہاں اسی کی مزید وضاحت یوں کی کہ مسلمانوں کو غالب کیا جائے گا اور جن مسجدوں سے ان کو روکا جاتا ہے صرف یہی نہیں کہ ان پر ان کا پورا تصرف ہوگا بلکہ ان کو اس قدر فتوحات دی جائیں گی کہ وہ جدھر منہ پھیریں گے ادھر ہی فتح وظفر ان کے ساتھ ہوگی۔ اور ادھر ہی اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی ہوگی۔ کیونکہ مشرق ومغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ ہمارے لیے اس میں یہ تسلی ہے کہ وہ خدا جس نے ایک زمانہ میں مشرق میں اسلام کو غالب کیا وہی اب مغرب میں بھی اسے غالب کرے گا۔

148- ﴿وَلَدًا﴾ وَلَدٌ بمعنی مولود ہے جو جنا گیا۔ اور واحد جمع چھوٹے بڑے پر استعمال ہوتا ہے اور متبنّٰی کو بھی وَلَدٌ کہا جاتا ہے۔ ﴿اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ [يوسف: 21:12] ''یا ہم اسے بیٹا بنالیں گے۔'' (غ)

## لفظ ولد کا استعمال مجازی:

اور مجازاً کہا جاتا ہے: [أَرْضُ الْبِلْقَاءِ تَلِدُ الزَّعْفَرَانَ] یعنی بلقاء کی سرزمین سے زعفران پیدا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے: [اَللَّيَالِيْ حُبَالٰى لَيْسَ يُدْرِيْ مَا يَلِدْنَ] راتیں حاملہ ہیں کوئی نہیں جانتا ان سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: [صُحْبَةُ فُلَانٍ وَلَادَةٌ لِلْخَيْرِ] فلاں کی صحبت سے خیر پیدا ہوتی ہے۔ (ت) اور تولید بمعنی تربیت آتا ہے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا: [اَنَا وَلَدْتُّكَ] جس کے معنی ہیں میں نے تمہاری تربیت کی۔ نصاریٰ نے اسے ولد سمجھ لیا اور تحریف کی۔ (ت)

﴿قٰنِتُوْنَ﴾ قنوت خضوع کے ساتھ طاعت کو لازم کر لینا اور محض خضوع اور محض طاعت پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ)

## عیسائی عقیدہ کی بنیاد:

یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سورت میں زیادہ تر بحث یہود کی غلطیوں سے کی ہے اور کسی قدر عیسائیوں کی اور آل عمران میں عیسائیت پر مفصل بحث ہے، یہودیت سے کم۔ اتمام حجت کے لیے یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کی اصل بنیاد کو لیا ہے یعنی مسیح کی ابنیت کا عقیدہ۔ کیونکہ کفارہ کا مدار بھی ابنیت مسیح پر ہی ہے۔

## ابنیت مسیح کا عقیدہ:

عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن نے عیسائیوں کی طرف اتخاذ ولد کا عقیدہ منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ابن مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولد کا لفظ صرف حقیقت پر بولا جاتا ہے اور ابن مجازاً بھی بولا جا سکتا ہے۔ یوں تو قرآن شریف نے دونوں لفظ بولے ہیں یعنی یوں بھی فرمایا ہے: ﴿وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ: 30:9] ''اور عیسائی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔'' مگر اکثر ذکر اس عقیدہ کا لفظ اتخاذ ولد میں ہی کیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان کے عقیدہ کی نامعقولیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

## خدا کا بیٹا بطور مجاز:

ظاہر ہے کہ اگر عیسائی مسیح کو مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا مانتے ہیں تو مجازاً یہ لفظ اوروں پر بھی بولا گیا ہے۔ اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ نخست زادہ کہلایا [خروج: 22:4] اور خود مسیح کہتے ہیں: ''مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔'' [متی: 9:5] اور پھر کہتے ہیں: ''اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستاویں ان کے لیے دعا مانگو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے بنو۔'' [متی: 45, 44:5] یعنی ہر ایک شخص راستباز بن کر خدا کا بیٹا بن سکتا یا کہلا سکتا ہے۔

## انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا:

اور یہی مجازاً استعمال اس لفظ کا ہے اور انجیل گواہ ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے لیے بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں دوسروں پر اس کا بولنا جائز ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے اسے کہا کہ ہم تجھے پتھراؤ کریں گے اس لیے کہ تو کفر بکتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کہتا ہے تو حضرت مسیح نے یوں جواب دیا:

''اور کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا تم خدا ہو جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا

## بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى — مادہ کے بغیر آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے(149)

کا کلام آیا۔۔۔۔تم اس شخص سے جسے باپ نے مخصوص کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اس لیے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں۔'' [یوحنا: 10:33-36]

پس مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا بننے سے تو مسیح کی کوئی خصوصیت نہ رہی اور اگر اس کی خصوصیت قائم کی جائے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو پھر اسے حقیقی طور پر خدا کا بیٹا ماننا پڑے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ کو ان کی طرف منسوب کیا اور اسی لیے اس پر یہ اعتراض کیا ﴿وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ [الأنعام: 6:101] حقیقی بیٹا تو بغیر بی بی کے ہو نہیں سکتا اور تم خود بی بی کے قائل نہیں ہو۔

### ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے:

عیسائیوں کی اس خطرناک غلطی کا جہاں کہیں ذکر ہے اس کے بعد لفظ سبحان اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا ہے۔ سبحان کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اور بیٹا بنانے میں نہ صرف اس کی طرف ایک ظاہری عیب ہی منسوب کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح باپ بیٹے کا محتاج ہوتا ہے خدا بھی بیٹے کا محتاج ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی عیب ماننا پڑتا ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ خدا باپ میں عدل ہے رحم نہیں اور بیٹے میں رحم ہے۔ پس خدا کی صفات ناقص ہوئیں جہاں رحم جیسی چیز ہی موجود نہیں۔ اس لیے جواب دیا کہ وہ عقیدہ صحیح نہیں ہوسکتا جو خدا کی طرف عیب منسوب کرتا ہے۔

### ابنیت کے تعلق سے بڑھ کر مخلوق ہونے کا تعلق ہے:

اس کے بعد یہ فرمایا کہ زمین و آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ یہاں بھی ابنیت کی تردید کی ہے اور اس لیے کہ فرمایا کہ خدا تو سب کا خالق اور سب کا مالک ہے اور سب اس کے پورے پورے فرمانبردار ہیں۔ حالانکہ باپ بیٹے کا نہ خالق ہوتا ہے اور نہ مالک اور نہ ہی بیٹا باپ کا کامل فرمانبردار ہوسکتا ہے۔ پس جب خدا میں اور اس کی مخلوق میں باپ اور بیٹے کے تعلق سے بڑھ کر تعلق پہلے ہی موجود ہے تو پھر بیٹا بنانا لاحاصل ہوا۔

149- ﴿بَدِيْعُ﴾ بِدْعٌ یا اِبْدَاعٌ کے معنی ہیں ایسا بنانا جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کا وجود میں لانا۔ (غ) اور بدعت شریعت میں نئی بات داخل کرنے کا نام ہے۔

### بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں:

یہ آیت بھی ابنیت کے عقیدہ کی تردید کرتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا: ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الأنعام: 6:101] ''آسمانوں اور زمین کا عجیب پیدا کرنے والا۔ اس کا بیٹا کس طرح ہوسکتا ہے۔ اور اس کی کوئی جورو نہیں، اور اس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾

اور جب ایک کام کا حکم کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے، ہو، سو وہ ہو جاتا ہے۔(149)

وَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے، کہتے ہیں کیوں اللہ ہم سے کلام نہیں کرتا یا ہمارے پاس نشان نہیں آتا، اسی طرح اُنہی کے قول کی مانند ان لوگوں نے کہا، جو ان سے پہلے تھے ان کے دل ایک ہی جیسے ہیں ہم نے ان لوگوں کے لیے کھول کر باتیں بیان کر دی ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔(150)

---

جب خدا چیزوں کا ایسا خالق ہے کہ اس کو آلہ اور مادہ کی ضرورت نہیں اور بیٹے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے تو بیٹے کا تجویز کرنا خدا کی طرف پھر کمزوری کا منسوب کرنا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ وحدت سے کثرت نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ خدا ایک مدبر بالارادہ ہستی اور متصرف کامل ہے۔ بے جان قانون کی طرح نہیں۔

149- ﴿قَضٰى﴾ قضاءٌ کے معنی ہیں ایک امر کا فیصلہ کر دینا قول سے ہو یا فعل سے۔ اور اعلام یعنی اطلاع دے دینے اور حکم کے قطع کر دینے کو بھی قضاء کہا جاتا ہے۔ پس ﴿قَضٰى اَمۡرًا﴾ کے معنی ہوئے کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے یا کسی حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔

**اور قضاء و قدر میں یہ فرق ہے** کہ قدر کے معنی اندازہ کرنا ہیں اور قضاء اس پر اجرائے حکم کر دینا یا اس کا قطع کر دینا۔ (غ) یا قدر اندازہ ہے اور قضا اس کا نفوذ ہے۔ گویا ہر ایک معاملہ قضاء سے پہلے حالت قدر میں ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ نبی ﷺ ایک غار کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں کچھ پتھر گرنے کو تھے۔ تو آپ بھاگ کر آگے نکل گئے۔ کسی نے کہا: [أَ تَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ؟] کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟ فرمایا: [أَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ إِلٰى قَدْرِ اللّٰهِ] میں اللہ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔

## حکم کن:

مادہ کے غیر مخلوق ہونے کے قائل اعتراض کرتے ہیں کہ کن کا حکم کس کو دیتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ اس امر یا چیز کو جو علم الٰہی میں موجود ہے حکم ہوتا ہے۔ کیونکہ قضاء سے پہلے قدر ہے اور وہ چیز اندازہ الٰہی میں آچکی ہے گو ظاہر میں اس کا وجود نہیں۔ مادہ کا مخلوق ہونا تو خود بدیع لا کر بتا دیا۔ یہاں یہ بتانا ہے کہ جو کچھ انسانوں کے نزدیک ناممکن ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی کر دکھائے گا۔ اس کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں اور انسان کی محدود طاقت پر اللہ تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کا اندازہ کرنا غلط ہے۔

150- ﴿يُوۡقِنُوۡنَ﴾ يَقِيۡنٌ کے معنی [نمبر: 15] میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاج العروس میں ہے کہ یقین شک کے دور ہونے اور علم اور تحقیق

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور تجھ سے دوزخ والوں کے متعلق باز پرس نہ کی جائے گی۔ (151)

---

امر کو کہتے ہیں۔ پس اَیْقَنَ یا یُوْقِنُ کے معنی یہ نہیں کہ ایک بات کو یوں ہی مان لے بلکہ اس کے لیے اس امر کا علم حاصل ہونا اور اس کی تحقیق بھی ضروری ہے یعنی قطعی طور پر اس کو درست پانا۔ پس ﴿قَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس قوت یقین سے کام لیتے ہیں جو انسان کے اندر رکھی گئی ہے۔ جس طرح ﴿قَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوت عقل سے کام لیتے ہیں اور قوت یقین سے کام لینا یہ ہے کہ جب انسان ایک امر کو تحقیق کے بعد درست پاتا ہے تو پھر چھوٹے چھوٹے شبہات اس کے دل میں نہیں اٹھتے۔ اکثر لوگ جو حق سے محروم رہ جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں قوت یقین نہیں ہوتی یا اس سے کام نہیں لیتے اور چھوٹے چھوٹے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔

### خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض:

نصاریٰ کی غلطی کے ذکر کے بعد اب جاہل لوگوں کی ایک غلطی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا ان سے خود اس طرح کلام کرے جس طرح رسولوں سے کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کا قول نقل کیا ہے: ﴿حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: 6:124] یعنی کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں پر نازل کیا جاتا ہے۔

### مطالبہ نشان ہلاکت:

اور یا اگر ان سے کلام نہیں کرتا تو ان پر ایک عظیم الشان نشان بھیجے۔ اٰيَةٌ کی تنکیر اس کی عظمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ ہلاکت کا نشان نازل ہو جیسا کہ دوسری جگہ صاف مذکور ہے: ﴿فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ [الأنبياء: 21:5] یعنی جب پہلوں کی ہلاکت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں ہے تو وہی ہلاکت کا نشان ہم پر کیوں نہیں اترتا۔ دونوں باتوں کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔

151- ﴿بِالْحَقِّ﴾ حَقٌّ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 65]۔ یہاں بِالْحَقِّ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اقتضائے حکمت کے مطابق یعنی ضرورت حقہ کے پیش آنے پر تجھے بھیجا ہے اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حق یعنی صداقت دے کر تم کو بھیجا ہے کیونکہ وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ لائے حق ہی ہے۔

﴿بَشِيْرًا﴾ بشیر بشارت دینے والا ہے۔ بشارت کے لیے دیکھو نمبر 123۔ سب سے بڑی بشارت جو انبیاء اللہ لاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قرب کا پیدا ہونا ہے، جو انسان کا کمال حقیقی ہے۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۟﴿۱۲۰﴾

وقفِ منزل

اور یہودی تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی عیسائی، یہاں تک کہ تو ان کے مذہب کی پیروی کرے، کہہ اللہ کی ہدایت وہی (کامل) ہدایت ہے اور اگر تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم آیا تو تیرے لیے اللہ (کی سزا) سے بچانے والا نہ کوئی دوست اور نہ مددگار ہوگا۔(152)

---

﴿نَذِيْرًا﴾ کے معنی مُنْذِرٌ ہیں یعنی انذار کرنے والا (اِنْذَارٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 17]) یعنی ایسی خبر دینے والا جس میں انسان کو انجام بد سے ڈرایا جائے۔

﴿الْجَحِيْمِ﴾ جَحْمَةٌ۔ آگ کے شعلوں کی شدت کو کہتے ہیں۔اسی سے جَحِيْمٌ ہے۔

### خدا کس سے کلام کرتا ہے:

پہلی آیت کے سوال کا جواب دیا ہے۔ایک سوال یہ تھا کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ اس کا جواب دیا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو حق کے ساتھ خوش خبری دے کر بھیجا ہے اور وہ خوش خبری یہ ہے کہ اس کی اتباع سے انسان خدا کے قرب کو حاصل کر سکتا ہے۔اور جو خدا کے قرب کو حاصل کرلے گا خدا اس سے کلام بھی کرے گا۔اللہ تعالیٰ قدوس ہے، ناپاک لوگوں سے جو طرح طرح کے گندوں میں مبتلا ہیں وہ کس طرح کلام کر سکتا ہے۔ہاں اگر وہ رسول کی بشیر کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کا اتباع کریں۔

### نشان ہلاکت کا آنا:

اور دوسرا سوال تھا کہ ہم پر وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا جیسا پہلی قوموں پر آیا؟ تو اس کا جواب دیا کہ اسی سے ان کو ڈرانے کے لیے تو ہم نے تمہیں بھیجا ہے۔وہ تو آخر آئے گا۔آخری الفاظ میں بتایا کہ راہ راست پر لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں۔

152- ﴿مِلَّتَهُمْ﴾ مِلَّةَ کا اصل اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ سے ہے یعنی میں نے کتاب لکھوائی۔قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ [البقرة: 282:2] ''اور چاہیے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے۔'' اور مِلَّةَ دین کی طرح ہے یعنی وہ رستہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے لوگوں کو بتایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔

### ملة اور دین میں فرق:

اور اس میں اور دین میں فرق یہ ہے کہ مِلَّةَ صرف اس نبی کی طرف مضاف ہوتی ہے جس سے وہ مذہب چلتا ہے۔جیسے ﴿مِلَّةَ

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ

جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جیسا اس کی پیروی کرنے کا حق ہے، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جوکوئی اس کا انکار کرتا ہے

---

اِبْرٰهِيْمَ ﴾ یا ﴿ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ ﴾ [یوسف 12:38] ''اور میں اپنے بزرگوں کے مذہب کا پیرو ہوں۔'' اور اللہ کی طرف یا احادامت کی طرف یہ لفظ مضاف نہیں ہوتا اور بحیثیت مجموعی کل قوم کی طرف مضاف ہوجاتا ہے جیسے یہاں ہے مِلَّتَهُمْ اور دین خدا کی طرف یا احادامت کی طرف جیسے دین اللہ یا دینی مضاف ہوتا ہے اور ملة اس لحاظ سے کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رستہ بتایا اور دین جس کے معنی طاعت ہیں اس کے لحاظ سے جو اس کو قائم کرتا ہے۔ (غ)

﴿ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ اَهْوَاءٌ۔ هَوٰى کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نفس کا میلان شہوت یا خواہشات کی طرف۔ (غ) هَوٰى کے اصل معنی نفس کا ارادہ ہیں اور خیر اور شر دونوں میں اس کا استعمال ہے۔ (ت) مگر چونکہ اس کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا بھی ہیں۔ (ت) اس لیے اکثر استعمال اس کا ان خواہشات پر ہے جو معاصی میں داخل ہیں یا گری ہوئی خواہشات۔

علم کے معنی ہیں [إِدْرَاكُ الشَّيْءِ بِحَقِيْقَتِهِ]۔ (غ) یعنی کسی چیز کا اپنی حقیقت کے ساتھ ادراک۔ خواہ اس کی ذات کا ادراک ہو اور اس صورت میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے: ﴿ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾ [الأنفال: 60:6] ''جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔'' اور خواہ کسی چیز کے لیے صرف یہ حکم ہو کہ اس کے لیے ایک دوسری چیز موجود ہے یا موجود نہیں۔ جیسے: ﴿ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ ﴾ [الممتحنة: 10:60] ''پھر اگر تم انہیں مومنہ جانو۔'' پھر علم کی ایک تقسیم نظری اور عملی ہے۔ نظری وہ ہے جو صرف علم حاصل کر لینے سے کامل ہوجاتا ہے جیسے موجودات عالم کا علم اور عملی وہ جو بغیر عمل میں آنے کے کامل نہیں ہوتا جیسے عبادات کا علم۔ اور ایک تقسیم علم کی عقلی اور سمعی ہے یعنی وہ جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ جو سماعت سے حاصل ہوتا ہے۔ (غ) یہاں اَهْوَاءٌ کے مقابل پر علم کا لفظ اختیار کر کے بتایا ہے کہ حقیقی مذہب ایک علم یا سائنس ہے اس کی کوئی بات دلائل سے خالی نہیں اور وہ ایک قاعدہ اور قانون کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈھکوسلوں کا نام مذہب نہیں۔

### اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے:

یہاں ہر ایک شخص مخاطب ہے اور بتایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ حقیقت کی طرف تو غور نہیں کرتے کہ اسلام میں کیا کیا صداقتیں ہیں اور کس طرح مذہب کو کمال تک پہنچا دیا ہے، وہ صرف اسی شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو ان کے مذہب کو اختیار کر لے۔ مگر ان کا مذہب کیا ہے؟ اس کا نام یہاں اَهْوَاءٌ رکھا ہے۔ اپنی چند خواہشات ہیں جن کو دین میں داخل کر لیا ہے اور بالمقابل اسلام ایک علم ایک سائنس ہے جس نے مذہب کے سارے اصول کو کمال صفائی کے ساتھ بیان کیا اور ان کے باہم تعلقات قائم کیے اور ان کی حقانیت کے دلائل دیئے۔ اسی کو یہاں الھدیٰ کہا ہے یعنی کامل ہدایت نامہ۔ پس صرف یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے ایک مسلم اس کامل ہدایت نامہ کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔ آج بہتیرے لوگ محض عیسائیوں کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام کے پاک اصول کو چھوڑ کر جو کچھ عیسائی کہتے ہیں ان کا تتبع کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک اللہ کو راضی

ع 14 9 14

يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

سو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (153)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تم کو دی، اور یہ کہ میں نے تم کو قوموں پر فضیلت دی۔ (154)

---

کرنے کی کوشش چاہیے تھی۔

153- ﴿الْكِتٰبَ﴾ سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔

﴿يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ کے معنی مجاہد سے مروی ہیں: [يَعْمَلُوْنَ بِهٖ حَقَّ عَمَلِهٖ] یعنی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا عمل کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 67]۔

## کامل علم کے بعد عمل کی ضرورت:

یہ رکوع قرآن کریم کے کامل ہدایت ہونے پر تھا۔ سو آیت ماقبل میں بالصراحت یہ ذکر کر کے اب رکوع کی آخری آیت میں عمل کی طرف توجہ دلائی ہے، بمقابلہ یہود ونصاریٰ کے اپنی کتابوں پر عمل نہ کرنے کے اور بتایا ہے کہ کامل ہدایت نامہ ہونے سے اسی صورت میں فائدہ ہوسکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی آنحضرت ﷺ کے صحابہ یہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جیسا پیروی اور عمل کرنے کا حق ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ کہہ کر بتایا کہ اصل ایمان تو یہی ہے کہ انسان اس پر عمل کرے۔

## صحابہ کا بے نظیر عمل قرآن پر:

فی الواقع اگر غور کیا جائے تو جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم پر عمل کیا کبھی کسی قوم نے کسی آسمانی کتاب پر اس طرح عمل کر کے نہیں دکھایا۔ ہزاروں سالوں کی بدیوں اور ہزاروں سالوں کے رسم و رواج سے قرآن کی آیات کے نزول پر وہ یوں پاک ہوتے جاتے تھے کہ گویا کبھی ان میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں۔ کوئی حکم قرآن شریف کا نازل نہیں ہوا جس کو انہوں نے فوراً عمل میں لا کر نہیں دکھایا۔

## مسلمانوں کی موجودہ حالت:

آج بھی لوگ مسلمان ہی کہلاتے ہیں مگر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک بھی حکم قرآن شریف کا نہیں جس پر عمل ہو۔ الا ماشاء اللہ معدودے چند اشخاص کو کچھ توجہ ہو تو الگ بات ہے۔ پس آج مسلمانوں کا شمار عملاً اس دوسرے حصہ میں ہے جو فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ کیونکہ جب حق عمل ادا نہیں کرتے تو ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔

154- **بنی اسرائیل کو تین مرتبہ خطاب:** یہ تیسری مرتبہ بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ پہلے ان کو ان کی حالت موجودہ پر توجہ دلائی اور

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اس دن سے بچاؤ کرلو جب کوئی جی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند احکام سے آزمایا تو اس نے ان کو پورا کیا، فرمایا میں تجھے لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔(155) (ابراہیم نے) کہا اور

---

بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو جانے سے وہ دنیا میں معزز بن جائیں گے۔ دوسری مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بعد کے زمانہ اور حضرت موسیٰ اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اب تیسری مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے کا زمانہ اور ابراہیمی وعدہ یاد دلاتا ہے اور یہی اس کا تعلق پہلے مضمون سے ہے۔ گویا اس طرح تین دفعہ خطاب کر کے اور ابتدائی وعدے یاد دلا کر بنی اسرائیل پر اتمام حجت کیا ہے۔

155- ﴿ابْتَلٰٓى﴾ بَلٰى سے ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 73]۔ اَبْلٰى اور اِبْتَلٰى کے معنی میں امام راغب نے لکھا ہے کہ دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک اس کے حال سے واقفیت حاصل کرنا، دوسرے اس کی خوبی اور نقص کا ظاہر کر دینا۔ اور بسا اوقات یہ دونوں باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ اور بسا اوقات ان میں سے ایک ہی مقصود ہوتی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ فاعل ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی خوبی یا نقص کا ظاہر کر دینا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ حالات سے تو واقف ہی ہے۔ (غ) اور چونکہ اصل غرض ابتلا یا امتحان کی صرف خوبیوں یا نقصوں کا اظہار ہی ہوتا ہے اور حال سے واقفیت حاصل کرنا صرف ایک ذریعہ ہے جس کے بغیر انسان دوسرے کی جودت یا رداءت کا اظہار کرنے کے قابل ہی نہیں ہو سکتا اس لیے [نمبر: 27] میں جو اصول قائم کیا گیا ہے اس کے مطابق بھی اِبْتَلٰى کے یہی معنی ہیں یعنی مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات کا ظاہر کرنا ہی ہے۔

﴿اِبْرٰهٖمَ﴾ عبرانی نام ہے، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دو عظیم الشان قوموں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کا زمانہ غالباً کوئی 2300 سال قبل مسیح ہے اور یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک ایک عظیم الشان پیغمبر تھے۔ بلکہ مشرکین عرب بھی آپ کی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ بائبل کے محرف ثابت ہونے کی وجہ سے یہ خیال بھی ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی تاریخی انسان نہ تھے۔

## عرب سے تعلق:

مگر عرب کی روایات اور عرب کا آپ سے تعلق اور خانہ کعبہ میں آپ کے نشانات اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ میری اولاد سے؟ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ (156)

﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ کے معنی [نمبر: 57] میں بیان ہو چکے۔ کلمات اللہ سے مراد احکام الٰہی ہیں۔ (غ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ یہ تیس احکام ہیں جن میں سے دس مومنوں کی صفت میں سورۂ براءت میں ہیں، دس احزاب میں، دس معارج میں۔ (ر)

﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ اَتَمَّ۔ کسی چیز کا تمام اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے سے باہر کسی کی محتاج نہ رہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى﴾ [النجم: 37:53] ''اور ابراہیم کے جس نے وفا دکھلائی۔'' اور یہاں آگے آتا ہے: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرة: 131:2] ''جب اس کے رب نے کہا فرمانبردار رہ، کہا میں جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوں۔''

﴿اِمَامًا﴾ اِمَامٌ۔ اَمَّ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے قصد کیا اور امام وہ ہے جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ انسان ہو جس کے قول یا فعل کی پیروی ہو، یا کتاب یا اس کے سوائے کچھ اور ہو، حق پر ہو یا باطل پر۔ (غ) باطل پیشرووں پر بھی یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے: ﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ [القصص: 41:28] ''اور ہم نے انہیں (ایسے) پیشرو بنایا جو آگ کی طرف بلاتے ہیں۔'' اور ﴿يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ﴾ [بني إسرائيل: 71:17] ''جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے سرداروں کے ساتھ بلائیں گے۔'' میں امام کے معنی کتاب بھی لیے گئے ہیں۔

## کلمات سے حضرت ابراہیمؑ کی تکمیل نفس:

وعدہ ابراہیمی کے ذکر سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جو تینوں قوموں یہود، عیسائی اور مشرکین عرب کے نزدیک مسلم راستباز تھے۔ پہلے احکام جو آپ کو دیئے گئے وہ اپنی ذات کے کمال کے لیے تھے۔ جب آپ ان میں پورے اترے تو پھر آپ کو امام بنایا گیا۔ یعنی دوسروں کا پیشرو مقرر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی احکام الٰہی کا کامل فرمانبردار ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے لوگوں کا پیشوا بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو ﴿شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرة:143:2] یعنی دوسری قوموں کا پیشرو بنایا گیا تھا۔ مگر جب وہ اپنی تکمیل نفس سے ہی غافل ہو گئے تو دوسروں کے پیشرو بننے کے بھی اہل نہ رہے۔

156- ﴿ذُرِّيَّتِيْ﴾ ذُرِّيَّةٌ اصل میں چھوٹی اولاد کو کہتے ہیں۔ مگر چھوٹوں بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ یہ یا ذَرَأَ سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنا ہیں اور ہمزہ متروک ہو گیا ہے اور یا ذَرٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی پھیلانا ہیں۔ (غ)

## وعدۂ ابراہیمی:

چونکہ اصل مقصد وعدہ ابراہیمی کو یاد دلانا ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے متعلق جو وعدے تھے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل صحیفے تو اب نابود ہیں ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیدائش میں کچھ ذکر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور آپ کی اولاد کے ساتھ وعدوں کا اب بھی موجود ہے۔ ان کئی بابوں کے مضمون کو یہاں چند پر معنی الفاظ میں جن میں سے ایک ایک اپنے اندر وہ حکمت کی باتیں لیے ہوئے ہے جو کتاب پیدائش میں مفقود نظر آتی ہیں بیان کیا ہے۔

## قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا، کیونکہ بائبل کی اصلاح کرتا ہے:

بائبل کے کئی بابوں کے قائمقام یہ چند لفظ ہیں: ''کہا اور میری اولاد سے، فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا''۔ یعنی تیری اولاد کو بھی ہم دنیا میں پیشرو بنائیں گے، برکت دیں گے، عزت دیں گے۔ لیکن اگر یہ لوگ ظلم کی طرف جھک جائیں تو پھر وہ اس وعدہ کے مستحق نہ رہیں گے۔ کیا حق وحکمت کی بھری ہوئی بات کہہ دی۔ مگر بائبل میں یہ مفقود ہے۔ وہاں لفظ عام ہیں: ''تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاویں گی۔'' [پیدائش: 18, 17:22] پس یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے بیانات بائبل سے نہیں لیے گئے۔ کیونکہ بائبل کے نقصوں کا وہ علاج کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی ان الفاظ میں بتایا ہے کہ جب وہ ظلم اختیار کریں گے تو وہ بھی وعدہ الٰہی کی برکات سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

## وعدہ ابراہیمی میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں شامل ہیں:

﴿مِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ کا لفظ لا کر یہ بھی بتادیا ہے کہ اس وعدہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں شامل تھے اور گو یہود اور عیسائی اس کا انکار کرتے ہیں مگر بائبل سے اب بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اول اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام دونوں کی پیدائش سے پہلے حضرت ابراہیم کو فرمایا:

''میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا۔'' [پیدائش: 3,2:12]

یہاں برکت دینے کے لفظ قابل غور ہیں۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو برکت دینے والے مسلمان ہی ہیں جو پانچوں نمازوں میں [ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ ] پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وعدہ ہے: ''میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے نہ گنی جائے۔'' [پیدائش: 10:16] پھر اسماعیل علیہ السلام کا نام لے کر فرمایا:

''اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' [پیدائش: 20:17]

یہی برکت دینے کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تھا وہی اسماعیل علیہ السلام سے بالخصوص ہے۔ پس بائبل یہودیوں اور عیسائیوں کو جھوٹا ٹھہراتی ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ابراہیمی وعدہ میں شامل نہیں کرتے۔

## وعدۂ ابراہیمی میں حضرت اسماعیلؑ کی شمولیت پر تاریخی شہادت:

اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو بھی وعدہ ابراہیمی جس طرح بنی اسرائیل پر صادق آتا ہے اسی طرح بنی اسماعیل پر بھی صادق آتا ہے۔

''اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو، سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ اور جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا(157)

---

ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔''

### دوسرا عہد اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے:

''میں تجھ کو اور تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو۔'' [پیدائش: 17:7, 8]

اب ایک طرف اگر بنی اسرائیل ختنہ کراتے ہیں اور اس عہد ابراہیمی کا نشان قائم رکھتے ہیں تو دوسری طرف بنی اسماعیل یعنی عرب کے لوگ بھی ختنہ کراتے ہیں اور اس عہد ابراہیمی کے نشان کو قائم رکھتے ہیں اور دنیا کی کسی اور قوم میں یہ نشان نہیں پایا جاتا۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اصل موعود وعدہ ابراہیمی کے ظہور پر ایک ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جو آپ کی روحانی اولاد ہونے کی وجہ سے اس عہد ابراہیمی کے نشان کو تا قیامت زندہ رکھتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا عہد ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ تھا کہ کنعان کا ملک اس کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دیا گیا۔ مگر وہ ملک اول یہود، پھر عیسائیوں، پھر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں وہ اس وعدے کے صحیح مصداق تھے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے اسی لیے بیت المقدس چھیننے کی کوشش کی گئی مگر آخر کار عیسائی ناکام رہے اور قریباً ایک سو سال کے بعد پھر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ اب پھر بظاہر یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے مگر ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر کوئی سامان پیدا کردے کہ یہ ملک مسلمانوں کو واپس ملے یا اس کے مالک مسلمان ہوجائیں۔

### بیت المقدس کا دو دو مرتبہ اصل حق داروں کے ہاتھ سے نکلنا:

بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی دو ہی دفعہ بیت المقدس ان کے قبضہ سے نکلتا ہے۔ پہلی مرتبہ وہ خود ہی دوبارہ اس میں آباد کردیئے جاتے ہیں جب خورس شاہ ایران نے بابلیوں کو تباہ کیا۔ دوسری مرتبہ سے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے بعد بیت المقدس تباہ ہوا۔ تو اس کے تباہ کرنے والے یعنی رومی آخر خود عیسائی ہوگئے۔ اسی طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنی قوت و بازو سے بیت المقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ سے لیا۔ دوسری مرتبہ شاید یونہی مقدر ہوجائے کہ جس قوم نے اس کو لیا ہے وہ مسلمان ہوجائے۔

157- ﴿الْبَيْتَ﴾ بَيْتٌ اصل میں اس مقام کو کہتے ہیں جو رات کو جائے پناہ کا کام دے۔ کیونکہ بَاتَ کے معنی ہیں رات کاٹی اور بَيَّتَ کے معنی ہیں رات کو مشورہ کیا یا کام کیا۔ فرمایا: ﴿بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ﴾ [النسآء: 4:81] ''ان میں سے ایک گروہ رات کو مشورہ کرتا ہے۔'' (غ) مطلق اَلْبَيْتُ سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔

### دنیا کی پہلی عبادت گاہ:

قرآن کریم میں اس کو ﴿اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران: 3:96] فرمایا یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی بھلائی کے لیے

مقرر کیا گیا۔ یعنی سب سے پہلی عبادت گاہ۔ اور ایک جگہ اس کو ﴿ بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ [الحج: 29:22] بھی فرمایا۔ یعنی قدیم گھر۔ ان دونوں ناموں کے علاوہ اس کا اَلْبَیْت کے نام سے مشہور ہوجانا صاف بتاتا ہے کہ اس گھر کو کوئی ایسی خصوصیت دنیا میں حاصل ہونے والی ہے جو کسی دوسرے گھر کو حاصل نہیں ہوئی۔

﴿ مَثَابَةً ﴾ ثَوْب سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا پہلی حالت کی طرف رجوع کرنا ہیں۔ (غ) اور اس کا مادہ وہی ہے جو ثَوَابٌ اور مَثُوْبَةٌ وغیرہ کا مادہ ہے اور مَثَابَةً وہ جگہ ہے جہاں لوگ بار بار لوٹ کر آئیں۔

## تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب:

اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ۔ (ت) دونوں معنی کے لحاظ سے خانہ کعبہ اس لفظ کا مصداق ہے کیونکہ لوگ تا قیامت وہاں حج کے لیے آتے رہیں گے اور کیونکہ مذاہب عالم میں تفرقہ پیدا ہوجانے کی وجہ سے یہ مقام پھر ان کے اجتماع کا اور کل نسل انسانی کو ایک کرنے کا موجب ہوا۔

﴿ اَمْنًا ﴾ مصدر ہے۔ بطور مبالغہ یہاں لایا گیا ہے۔ اور مراد مقام امن ہے۔

## خانہ کعبہ کی قدامت پر میور کی شہادت:

﴿ الْبَیْتِ ﴾ یا بَیْتُ اللہِ خانہ کعبہ وہ پاک گھر ہے جس کی شہرت اور عزت عرب میں ایسے قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے جس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ سر ولیم میور ایک مخالف اسلام بھی یہ تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے:

’’مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لیے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پیشتر لکھتا ہوا عرب کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزت کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں یقیناً خانہ کعبہ کا جو مکہ میں ہے، ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اور کسی معبد کا عرب میں نام بھی نہیں جس کی عزت عرب میں عام طور پر ہوئی ہو۔ زبانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے کعبہ کا حج عرب کے ہر گوشہ کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یمن اور حضرموت سے خلیج فارس کے کنارہ سے، شام کے بادیہ سے، حیرہ اور عراق عرب سے لوگ ہر سال مکہ میں جمع ہوتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس قدر عام طور پر سارے ملک میں اس عزت کا حاصل ہونا یقیناً ایک ایسے قدیم زمانہ سے ہونا چاہیے جس کے پرے اور کوئی قدیم زمانہ تجویز نہیں ہوسکتا۔‘‘

## بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد:

بائبل میں بھی بیت ایل کا ذکر آتا ہے جس کا تعلق ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے مگر بائبل کا بیان بیت ایل کے مقام کی تعیین میں قابل اعتبار نہیں اور اس پر بعد کے خیالات کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ دنیا میں آج صرف ایک ہی مقام ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس پر بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بولا گیا ہے اور وہ خانہ کعبہ ہے۔

## کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں:

یہاں اس کے متعلق دو پیشگوئیاں بھی ہیں۔ اول یہ کہ یہاں لوگ تا قیامت جمع ہوتے رہیں گے یہ کبھی متروک نہ ہوگا، نہ برباد ہوگا

وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ اور ابراہیم کے مقام کو قبلہ نماز بناؤ(158) اور ہم نے

نہ دنیا کی کوئی طاقت لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روک سکے گی اور تفرقہ کے بعد لوگوں کا یہاں اجتماع ہوگا۔ دوسرا یہ کہ یہ ہمیشہ امن کا مقام رہے گا۔ چنانچہ اس کا نام ہی حرم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ [العنكبوت: 67:29] کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے اور ان کے اردگرد کے لوگ زبردستی اچک لیے جاتے ہیں۔ یعنی اس کے اردگرد دن رات جنگیں رہتی ہیں اور لوگوں کے لیے امن نہیں مگر اس مقام میں ایسا امن ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کو توڑ سکے۔ عرب کی خونخوار طبائع کو جن میں دن رات جنگیں رہتی تھیں اس مقدس گھر کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ایسا جھکایا کہ اس کی حدود کے اندر ان کی خونریزی کبھی ظاہر نہ ہوتی تھی یہ خدائی تصرف تھا۔ ورنہ اتنے بڑے ملک کا خود اتفاق کر کے اس بات کو عمل میں لانا اور عین جنگ کے جوش کے وقت میں اس پر قائم رہنا محال تھا۔ جب مہذب سے مہذب قومیں بھی خونریزی کو اپنے انتہا تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں۔

## خانہ کعبہ پر کبھی اس کے دشمن قابض نہ ہوں گے:

مقام امن کہنے میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اس کا دشمن کبھی اس پر قابض نہ ہوگا بلکہ یہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا جو دل سے اس کی عزت واحترام کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور گو بت پرست بھی اس پر قابض رہے مگر وہ بھی دل سے اس کا احترام کرنے والے تھے اور جب ایک عیسائی بادشاہ نے اسے منہدم کرنے کی نیت سے حملہ کیا تو وہ اور اس کا لشکر تباہ ہو گئے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون کبھی داخل نہ ہوں گے۔

158- ﴿مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ﴾ خانہ کعبہ میں ایک معروف مقام ہے جو چھ ستونوں پر قائم اور آٹھ فٹ بلند ہے۔ یہاں طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ مگر یہاں مقام ابراہیم سے مراد بعض کے نزدیک مواقف حج، بعض کے نزدیک عرفات، مزدلفہ وغیرہ ہیں اور بعض کے نزدیک سارا حرم اور بعض کے نزدیک خود خانہ کعبہ اور یہی درست ہے۔

﴿مُصَلًّى﴾ نماز کی جگہ کو کہتے ہیں اور مجازاً قبلہ مراد ہے (ر) جیسا حدیث [مَسْجِدِيْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ مِنْ مَسْجِدِيْ] ''میری مسجد تمام مساجد پر ختم ہے۔'' یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے۔

## خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم:

یہاں مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔ بعض نے مزدلفہ، عرفات وغیرہ میں ذکر کو مراد لیا ہے۔ مگر بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا [يَا رَسُولَ اللهِ! لَوِ اتَّخَذْتَ مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى] (جامع الترمذي، كتاب التفسير، باب ومن سورة البقرة: 2960؛ سنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب القبلة: 1009 یا رسول اللہ! اگر آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اب یہ سورت مدنی ہے اور ظاہر ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عرض کرنے کا یہ منشا نہ ہو سکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں چل کر آپ دو رکعت نماز پڑھیں یا مزدلفہ، عرفات میں ذکر کریں۔ کیونکہ خود حج ہی رکا ہوا تھا۔ پس اس سے مراد سوائے اس کے

عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کردو طواف کرنیوالوں کے لیے اور اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع کرنیوالوں، سجدہ کرنیوالوں (کے لیے)۔ (159)

---

کچھ نہیں ہوسکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے کہ جب یہ ذکر ہوا کہ خانہ کعبہ کو ہم نے لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا ہے تو ساتھ ہی اس کے قبلہ بنانے کا ذکر ہو۔ یہی حکم یہاں دیا گیا ہے اور اس پر جو اعتراض ہوئے ان کا جواب ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ﴾ [البقرۃ: 142:2] ''بیوقوف لوگ کہیں گے۔'' سے شروع ہوتا ہے۔

159- ﴿عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى﴾ عَهِدَ فُلَانٌ اِلٰى فُلَانٍ کے معنی ہیں کہ اس کے سامنے ایک عہد پیش کیا اور اس کی حفاظت کی تاکید کی۔ (غ) یعنی عَهِدَ کا صلہ الی ہو تو اس کے معنی حکم دینا ہوتے ہیں۔

﴿اِسْمٰعِيْلَ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند کا نام ہے جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے اور گو بائبل میں ان کو لونڈی کہا گیا ہے مگر وہ مصر کے شاہی خاندان میں سے تھیں۔ شاید قومی امتیاز کی وجہ سے ان کو لونڈی کہا گیا ہے۔ اسماعیل ان کا نام ان کی والدہ کو فرشتہ نے بتایا تھا جیسا کہ کتاب پیدائش میں مذکور ہے اور یہ سمع اور ایل سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں اللہ نے سن لیا۔

## اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ حکم خدا سے مکہ میں چھوڑے گئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو کسی دوسرے مقام پر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ اسی حکم کے مطابق (جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں) نہ حضرت سارہ علیہا السلام کے کہنے سے جیسا کہ بائبل میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام کو خانہ کعبہ کے قریب چھوڑا جس کی صریح شہادت قرآن کریم کے ان الفاظ میں موجود ہے: ﴿رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ [ابراھیم: 37:14] ''ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس اس وادی میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں۔'' بائبل میں ہے کہ فاران میں ان کو چھوڑا۔ عیسائی اس سے مراد ملک شام کا ہی کوئی جنگل لیتے ہیں جو واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے بلکہ عرب کا اسماعیل کی اولاد سے ہونا ایک امر مسلم ہے جس کا کوئی عیسائی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ قیدار جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام ہے۔ [پیدائش: 13:25] اس کا استعمال بائبل میں قوم عرب کی جگہ پایا جاتا ہے۔ [زبور: 5:10، یسعیاہ: 11:42 و: 7:60] وغیرہ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى

اور جب ابراہیم نے کہا میرے رب! اس کو امن والا شہر بنادے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو کوئی ان میں سے اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لائے،(160) فرمایا اور جو کافر ہوگا تو اسے بھی تھوڑا فائدہ اٹھانے دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف

---

عرب کا اسماعیل کی اولاد سے ہونا:

دوسری طرف عرب کی روایات حضرت اسماعیل علیہ السلام کے یہاں آنے کو یقینی ٹھہراتی ہیں۔ خود خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار موجود ہے، صفا اور مروہ میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی۔ اور عرب کا نہ صرف اپنا دعویٰ ہے کہ وہ اولاد اسماعیل ہیں بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تک برابر ان کے نسب نامے چلتے ہیں۔

﴿طَهِّرَا﴾ تَطْهِيْرٌ کے معنی میں ظاہری طور پر اور باطنی طور پر پاک کرنا دونوں شامل ہیں۔ یہاں بتوں کی ناپاکی سے اور شرک باللہ سے تَطْهِيْرٌ مراد ہے۔ (ج)

﴿لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ طَائِفٌ۔ طَوْفٌ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنا ہیں۔ پس طائفین وہ ہیں جو اس کے طواف کے قصد سے آتے ہیں۔

﴿الْعٰكِفِيْنَ﴾ عَاكِفٌ۔ عُكُوْفٌ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی تعظیم کے لحاظ سے اس کے ساتھ تعلق پیدا کرلینا۔ (غ) اسی سے اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں مسجد میں رہنے کا نام ہے۔ عَاكِفِيْنَ سے مراد بعض لوگوں نے مُقِيْمِيْنَ مکہ کو لیا ہے مگر مراد صرف عبادت کے لیے بیٹھنے والے ہیں۔ بحالت طواف طَائِفٌ ہیں، بحالت عبادت عَاكِفٌ، بحالت رکوع رَاكِعٌ (جمع رُكَّعٌ)، بحالت سجدہ سَاجِدٌ (جمع سُجُوْدٌ)۔

تطہیر کعبہ:

یہاں حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو خانہ کعبہ کی تطہیر کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ وہاں پہلے سے موجود تھا مگر وہاں بت وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے۔ اور تطہیر سے مراد بتوں سے پاک کرنا اور بت پرستی اور شرک کو دور کرنا ہی ہے۔ ہاں اس کی کامل تطہیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہونی مقدر تھی۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے اس کی دوبارہ تعمیر بھی کی ہے جیسا آگے ذکر آتا ہے۔

160 - ﴿بَلَدًا﴾ بَلَدٌ وہ مکان ہے جو خطوط سے محدود ہو اور اس کے ساکنوں کے اجتماع اور ان کی اقامت سے اس کے اندر انس کی حالت پائی جائے۔ (غ) جس طرح مطلق لفظ اَلْبَيْتُ خانہ کعبہ پر بولا گیا ہے اسی طرح مطلق البلد مکہ معظمہ پر بولا گیا ہے:

| | |
|---|---|
| عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ | بے بس کر دوں گا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ (161) |
| وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ | اور جب ابراہیم گھر کی بنیادیں اٹھاتا تھا اور اسماعیل (بھی) اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما تو سننے والا جاننے والا ہے۔ (162) |

---

﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ [البلد: 90:1] ”نہیں میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں۔“

### مکہ کے لیے دعائے ابراہیمؑ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تین باتوں کے لیے ہے۔ایک یہ کہ اس مقام کو بلد یعنی شہر بنا دے۔کیونکہ پہلے وہاں شہر نہ تھا گو خانہ کعبہ تھا اور دوسرے امن والا۔اور پھر اس جنگل میں اس کے رہنے والوں کے لیے پھل مہیا فرما دے۔﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ [إبراهيم: 14:37] یعنی بے آب و گیاہ جنگل میں رکھ کر یہ دعا بتاتی ہے کہ کس قدر ایمان اللہ کی قدرت پر تھا۔اور آج فی الواقع دنیا بھر کے پھل مکہ میں ملتے ہیں۔مگر دعا میں صرف مومنوں کی شرط رکھی۔یعنی آپ یہ چاہتے تھے کہ یہاں صرف مومن ہی آباد رہیں۔

161- ﴿فَاُمَتِّعُهٗ﴾ اُمَتِّعُ۔ مَتَاعٌ اس کا نفع حاصل کرنا ہے جو ایک وقت تک ممتد ہو۔(غ)۔پس اُمَتِّعُهٗ کے معنی ہوئے ایک وقت تک نفع اٹھانے دوں گا یعنی کفر یہاں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

﴿اَضْطَرُّهٗٓ﴾ اِضْطَرَّ۔ اِضْطِرَارٌ کے معنی ہیں انسان کو اس بات میں ڈالنا جو اس کے ضرر کا موجب ہو۔اِضْطِرَارٌ خارجی سبب سے بھی ہوسکتا ہے جیسے مغلوبیت سے بے بس ہونا اور داخلی سبب سے بھی بھوک وغیرہ سے۔(غ) [مزید تشریح کے لیے دیکھو نمبر: 211]۔

﴿الْمَصِيْرُ﴾ صَيْرٌ کے معنی شَقٌّ یعنی پھاڑنا ہیں اور صَارَ کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کیا۔اور مَصِيْرٌ وہ آخری حالت ہے جس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کر کے انسان آخر کار پہنچتا ہے۔(غ)

### عرب سے کفر مٹ جانے کی پیشگوئی:

اللہ تعالیٰ کا رزق تو کافر مومن کے لیے یکساں ہے اس لیے فرمایا دنیا کا رزق سب کو یکساں ملے گا کافر ہو یا مومن۔ہاں کافر کے لیے یہ تھوڑے دن کا رزق ہے یعنی حیات دنیا کا اور آخرت کے ثمرات سے جو اعمال کا نتیجہ ہیں وہ محروم رہ جاتا ہے۔یا تھوڑے دن کے فائدہ سے یہ مراد ہے کہ کفر آخر کار اس ملک سے مٹ جائے گا۔جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ہوا۔

162- ﴿الْقَوَاعِدَ﴾ قَاعِدَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی بنیاد ہیں اور یہ قَعَدَ سے ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں۔(غ)

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا فرمانبردار بنا، اور ہماری نسل سے ایک گروہ اپنا فرمانبردار (بنائیو) اور ہمیں ہمارے (حج کے) اعمال بتائیو اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما، تو رحمت سے توجہ فرمانے والا، رحم کرنیوالا ہے۔ (163)

---

﴿تَقَبَّلْ﴾ قَبَّلَ سے ہے جس کے معنی پہلے ہیں اور قَبِلَ کے معنی ہیں اس نے قبول کیا ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ [البقرة: 48:2] ''نہ ان سے سفارش قبول کی جائے گی۔'' ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ [البقرة: 123:2] ''اور نہ ان کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا۔'' اور تَقَبُّلٌ کے معنی ہیں ایسے رنگ میں کسی چیز کا قبول کرنا جس کا مقتضی ثواب ہو جیسے ہدیہ کا قبول کرنا ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ [الأحقاف: 16:46] ''یہی وہ ہیں جن سے ہم ان کے بہترین عمل قبول کرتے ہیں۔'' ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ [آل عمران: 37:3] ''سو اس کے رب نے اس کو اچھی قبولیت سے قبول کیا۔'' ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المآئدة: 27:5] ''اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔''

﴿السَّمِيْعُ﴾ سَمِعَ اس قوت کا نام ہے جس سے سنا جاتا ہے اور سننے کے فعل کا بھی۔ (غ) اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو سَمِيْعٌ ہے وہ بمعنی سَامِعٌ ہے یعنی سننے والا۔ ہاں اس کا سننا اس سے پاک ہے کہ وہ انسان کی طرح کان کا یعنی آلہ کا محتاج ہو۔ (ت) اور یہی بات اس کی سب صفات میں پائی جاتی ہے۔

**ابراہیمؑ کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا:**

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بنایا۔ مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ خانہ کعبہ ان سے پہلے بھی موجود تھا اس لیے کہ قرآن شریف اور احادیث سے اور خود تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہ دنیا میں خدا تعالیٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے [دیکھو نمبر: 157]۔ پس چونکہ ہدایت و رشد کے اول معلم حضرت آدم ہیں۔

**خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا:** اول مرتبہ یہ انہی کے ہاتھ سے بنا اور دوسری مرتبہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اس کو بنایا۔ تیسری دفعہ قریش نے آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ پہلے اسے بنایا۔ جب حجر اسود سرور عالم نے نصب فرمایا۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر یہ بنایا گیا ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بنایا اور ایک دفعہ حجاج نے۔ گویا کل پانچ مرتبہ بنایا گیا۔ دو دفعہ آنحضرت ﷺ سے پیشتر اور دو دفعہ آپ سے بعد اور ایک دفعہ آپ کی زندگی میں۔ جیسے معمار خانہ کعبہ کو ملے ایسے کبھی کسی اور گھر کو نہیں ملے۔ بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا۔

**خانہ کعبہ بنانے والے مزدور:** مگر جس طرح حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ جیسے پاک اور فخر بنی نوع انسانوں نے خود کعبہ کے بنانے میں مزدوروں کا کام کیا ایسے مزدور نہ بیت المقدس کو نصیب ہوئے اور نہ کسی اور گھر کو۔

163 - ﴿مُسْلِمَيْنِ﴾ مُسْلِمٌ کا تثنیہ ہے۔ اسلام کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 144]۔ مُسْلِمٌ اس لیے مسلم کہلاتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۠﴿۱۲۹﴾

ع 15 8 15

اے ہمارے رب! اور اُن میں اُنہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے، تو غالب حکمت والا ہے۔ (164)

---

کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے یا شیطان کی غلامی سے محفوظ ہو جاتا ہے یا حق کا پورا پورا فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ (غ)

﴿اُمَّةً﴾ اُمٌّ کے معنی ماں ہیں۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے یعنی ہر ایک چیز کو جو کسی شے کے وجود یا تربیت یا اصلاح یا آغاز کے لیے بطور اصل ہو اُمٌّ کہا جاتا ہے اور اُمَّةٌ کے معنی ہیں ہر ایک جماعت جن کو ایک امر جمع کرے خواہ ایک دین ہو یا ایک مکان یا ایک زمانہ اور خواہ یہ امر جامع تسخیر سے ہو یا اختیار سے۔ (غ) جمع اُمَمٌ ہے۔ اصطلاح شریعت میں اُمَّةٌ وہ ہے جسے ایک دین ایک جماعت بنائے۔

﴿اَرِنَا﴾ اَرِ۔ رُؤْيَةٌ کا لفظ صرف آنکھ سے ادراک پر نہیں بلکہ وہم و تخیل یا تفکر یا عقل کے ساتھ ادراک پر بھی آتا ہے۔ (غ)

﴿مَنَاسِكَنَا﴾ مَنْسِكٌ اور مَنْسَكٌ کی جمع ہے اور نُسُكٌ کے اصل معنی عبادت یا بہت عبادت ہیں اور مَنَاسِكُ بالخصوص اعمال حج پر بولا جاتا ہے کیونکہ ان میں عبادت کے لیے معمولی حالت سے بہت کچھ بعد اختیار کرنا پڑتا ہے اور مَنْسَكٌ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا قرب تلاش کیا جائے اور نَسِیْكَةٌ ذبیحہ کو کہتے ہیں اور نہایہ میں ہے کہ نُسُكٌ وہ امور ہیں جن کا شریعت حکم دیتی ہے اور وَرَعٌ وہ جن سے وہ روکتی ہے۔

اس دعا میں دو امور کی طرف اشارہ ہے ایک ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً﴾ کی طرف کہ یہ حضرت ابراہیم کی دعاؤں کو پورا کرنے والی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ایک ہی امت مسلمہ کہلائی۔ گو سب انبیاء اللہ علیہم السلام مسلم ہی تھے۔ ہاں جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت مسلمان معدودے چند آدمی تھے جو گھروں سے بھاگ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوئے تھے اور دشمن ان کو چاروں طرف سے تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پس اس آیت کے نزول کے وقت یہ ایک پیشگوئی تھی۔ آج خدا کے فضل سے وہ ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً﴾ چاروں طرف دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

## اعمال حج ابراہیمؑ کے قائم کردہ ہیں:

دوسرے یہاں یہ بتایا کہ اعمال حج حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ سے قائم کیے گئے۔ یہ اعمال حج ہزارہا سال سے آج تک وہی چلے آتے ہیں پس یہ مشرکانہ رسوم نہیں بلکہ مؤحدین کے جد اعلیٰ کے قائم کردہ ہیں۔

164- ﴿یُزَكِّیْهِمْ﴾ یُزَكِّیْ۔ زَكَا کھیتی پر بولا جاتا ہے جب اس میں نمو اور برکت حاصل ہو۔ اور تَزْكِیَةُ نفس کا خیرات اور برکات سے بڑھانا ہے اور فعل تزکیہ کبھی بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے لیے اکتساب کرتا ہے جیسے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي

اور کون ابراہیم کے مذہب سے منہ موڑتا ہے سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا اور یقیناً ہم نے اسے

---

زَكّٰىهَا﴾[الشمس: 9:91] ''وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کیا'' اور کبھی خدا کی طرف کیونکہ فی الحقیقت وہی مزکی ہے ﴿وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾[النور: 21:24] ''لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے۔'' اور کبھی نبی کی طرف اس لیے کہ وہ واسطہ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں اور اس کے نمونہ سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہاں۔

﴿يُعَلِّمُهُمُ﴾ يُعَلِّمُ۔ اِعْلَامٌ اور تَعْلِيْمٌ میں یہ فرق ہے کہ اعلام اخبار سریع کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جلدی سے یا ایک دفعہ ایک بات کا علم دے دینا اور تعلیم میں تکریر اور تکثیر پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے متعلم کے نفس پر اثر باقی رہ جائے اور بعض نے کہا کہ تعلیم یہ ہے کہ معانی کے تصور کے لیے نفس کو آگاہ کیا جائے۔ (غ)

**تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے:** اور یہاں کتاب کے پڑھ دینے سے تعلیم کو الگ کر کے بتا دیا کہ تعلیم کتاب سے مراد اس کے معانی پر آگاہ کرنا ہے اور یہ رسول کے کاموں میں سے ایک کام ہے کہ وہ مومنوں کو کتاب کے معانی سمجھائے اور اس کی تشریح کرے جن لوگوں نے رسول کا کام صرف کتاب کا پڑھ دینا سمجھ لیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔

﴿الْحِكْمَةَ﴾ حِكَمٌ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روک دیا اور حِكْمَةٌ کے معنی ہیں علم وعقل سے حق کو پا لینا۔ (غ) یہاں حِكْمَةٌ سے مراد سنت، معرفت دینی، فقہ لی گئی ہے۔ (ج) یہ ظاہر ہے کہ حِكْمَةٌ کتاب سے علیحدہ کوئی چیز ہے اور اس کی تعلیم بھی رسول دیتا ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کو سنت کہا جاتا ہے۔ یعنی تفصیلات شریعت کیونکہ دوسری وہی چیز ہے جس کی تعلیم رسول دیتا ہے۔

﴿الْعَزِيْزُ﴾ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ عِزَّةٌ انسان کی وہ حالت ہے جو اسے مغلوب ہونے سے بچاتی ہے۔ پس اَلْعَزِيْزُ وہ ہے جو غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔

## دعائے ابراہیمؑ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی دعا کی طرف جو اس آیت میں مذکور ہے اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيْمَ] (المستدرك للحاكم: 453/2؛ قال الذهبي: صحيح) میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں یعنی اس دعا کی قبولیت میرے ذریعہ ظاہر ہوئی ہے۔

**دعا کا اثر:** اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بعض وقت اللہ تعالیٰ ایک دعا کا اثر ہزارہا سال بعد ظاہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ دنیا کی بہبودی اور بہتری ایک دن کا کام نہیں۔ بڑے کام ایک لمبے وقت کو چاہتے ہیں۔

## امت مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر پیشگوئی کے طور پر:

قرآن کریم نے یہ دعا دنیا کو اس وقت یاد دلائی جب ابھی نہ امت مسلمہ کا وجود تھا اور نہ اس امت مسلمہ کی تعلیم و تزکیہ کا۔ صرف

الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ دنیا میں برگزیدہ کیا اور بے شک وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں سے ہے۔(165)

---

چند مسلمان تھے جن کی جانیں معرض خطر میں تھیں اور سارا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک، فسق و فجور سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھر یہ دعا کس طرح پوری ہوئی کہ نا صرف سارا عرب ہی امت مسلمہ بنا بلکہ یہ امت مسلمہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیلی اور ان کا ایسا تزکیہ ہوا کہ پھر یہ دنیا کے مزکی بنے اور ان کو ایسی تعلیم کتاب و حکمت دی گئی کہ پھر یہ دنیا کے معلم بنے۔ جیسا کہ آگے اسی مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا: ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: 143:2] یعنی رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اور تزکیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کے معلم اور مزکی بننے کے اہل ہو گئے ہو اور اس لیے ہم نے تم کو دوسرے لوگوں کا پیشرو بنایا ہے۔

## رسول کے چار کام:

یہاں رسول کے چار کام بیان فرمائے ہیں۔ اول ان آیات کی تلاوت اپنی امت پر کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ کتاب جو اس پر نازل ہوتی ہے اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے۔ تیسرے ان کو حکمت سکھاتا ہے یعنی وہ باریک باتیں جو اس پر وحی خفی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ چوتھے وہ ان کے لیے نمونہ بن کر اور اپنی قوت قدسی سے ان کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے۔ جو شخص یہ چار کام نہیں کرتا وہ رسول نہیں۔

## علمائے ربانی:

ہاں علمائے ربانی اور امت کے لوگ بھی ایک رنگ میں یہ کام کرتے ہیں۔ مگر وہ رسول ﷺ پر جو آیات نازل ہوئیں ان کی تلاوت کرتے ہیں اور رسول پر نازل شدہ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں ان کی حکمت بھی رسول سے مستعار ہے اور ان کی قوت قدسی اسی رسول متبوع سے حاصل کی جاتی ہے۔

165- ﴿يَرْغَبُ﴾ رَغِبَ کا اصل مفہوم کسی چیز میں وسعت ہے اور رَغْبَةٌ۔ رَغْبٰی۔ رَغِبَ ارادہ میں وسعت ہے۔ رَغِبَ کا صلہ اِلٰی یا فِیْ ہو تو مراد اس چیز کی خواہش اور آرزو ہوتی ہے جیسے: ﴿اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ [القلم: 32:68] "ہاں ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔" میں اور صلہ عَنْ ہو تو مراد اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا ہوتا ہے جیسے یہاں۔ (غ)

﴿سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ سَفِهَ جسمانی ہلکا پن پر بولا جاتا ہے اور کم عقلی کی وجہ سے جو ہلکا پن نفس میں پیدا ہوتا ہے اس پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ سَفِهَ لازم ہے اور سَفِهَ نَفْسَهٗ اصل میں سَفِهَ نَفْسُهٗ تھا (غ) یا نَفْسَهٗ بطور تمیز ہے۔

﴿اصْطَفَيْنٰهُ﴾ اِصْطَفٰی کا اصل صَفْوٌ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا اور اِصْطِفَاءٌ کے معنی ہیں ایک چیز کے خالص حصہ کو لینا۔ اللہ تعالیٰ کا اِصْطِفَاءٌ دو طرح پر ہے ایک ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک رکھنا۔ دوسرے چن لینا اور برگزیدہ کرنا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کا نام مصطفیٰ ہے کیونکہ آپ کو تمام کھوٹوں اور ملاوٹوں سے پاک پیدا کیا گیا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾

جب اُس کے رب نے اُسے کہا فرمانبردار رہ، کہا میں جہانوں کے رب کا فرماں بردار ہوں۔(166)

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿١٣٢﴾

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی اور یعقوب نے (بھی) اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چن لیا ہے۔ پس نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبردار ہو۔(167)

---

**فیصلہ کے لیے ملت ابراہیمی کا اصل:**

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تقدس بہت سی قوموں میں مسلم تھا اس لیے اب ملت ابراہیمی کے اصل الاصول کو بیان کیا اور بتایا کہ اس کو ایک امر مشترک کے طور پر قبول کرلو تو مذہبی جھگڑا آسان ہو جاتا ہے اور اس کو رد کرنا خود اپنے مذہب کے اصل الاصول کے خلاف چلنا ہے۔

166- **عملی اصول:** پہلے ملت ابراہیمی کا اصل عملی رنگ میں بیان کیا اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کا کامل فرمانبردار ہو جو احکام الٰہی ہوں ان کے خلاف دنیا کے کسی مال، عزت، شہرت، آرام، جان تک کی پروا نہ کرے۔ اسلام یعنی فرمانبرداری کے ساتھ ربوبیت عالمین کا ذکر اس بات کے بتانے کے لیے ہے کہ وہ فرمانبرداری مخلوق میں خدا کی بھلائی کے لیے ہے گویا جس خیال کو ایک جگہ ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ﴾[النسآء: 125:4] ''اپنی ساری توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا اور وہ احسان کرنے والا ہے۔'' سے ظاہر کیا ہے اسی کی طرف یہاں ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں اشارہ کیا ہے۔

**مسلم کا مقام بلند:**

اسلام جس کو یہاں ملت ابراہیمی کا عملی اصل الاصول قرار دیا گیا ہے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ کامل فرمانبرداری جس کو اسلام کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اس امر کا مقتضی ہے کہ انسان کسی اور چیز کے آگے نہ جھکے خواہ وہ دنیوی مال و عزت کا لالچ ہو، خواہ خدا کے نیچے کسی دوسری طاقت کا خوف، سارے لالچوں اور ساری مشکلات کے ہوتے ہوئے اپنے فرض کا بجالانے والا حقیقی معنی میں مسلم ہے۔ اور یہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ہے جس پر انسان کھڑا ہو سکتا ہے۔

167- ﴿وَصّٰى﴾ وَصِيَّةٌ کے معنی ہیں دوسرے کے سامنے کوئی بات پیش کرنا جس پر وہ عمل کرے اس کو وعظ کے ساتھ ملاتے ہوئے۔ (غ) اصل معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں کہ حالت استحضار میں یا بستر مرگ پر بات کہی جائے۔

﴿يَعْقُوْبُ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے ان کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ بائبل میں

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

یا کیا تم موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا ہم تیرے خدا کی عبادت کریں گے اور تیرے بڑوں ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق کے خدا کی جو ایک ہی خدا ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ (168)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ان کے لیے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا، اور اس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔ (169)

---

ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہاں عیسو اور یعقوب توام پیدا ہوئے اس طرح کہ یعقوب کا ہاتھ عیسو کی ایڑی پر تھا اس لیے ان کا نام یعقوب ہوا۔ اسحاق کے ساتھ جو برکات کے وعدے تھے وہ صرف یعقوب کی نسل میں پورے ہوئے اور بنی اسرائیل یعقوب کی ہی اولاد ہیں۔

**ابراہیمؑ کا توحید پر قائم ہونا:**

اس میں یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیسے توحید الٰہی کے شیدا تھے کہ یہی وصیت انہوں نے اپنے بیٹوں کو کی اور ایسا ہی ان کے خاندان میں یہی اثر چلا یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو یہی نصیحت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی وصیت بھی امور دینی کے متعلق ہوتی ہے۔ یہ برگزیدہ وجود دنیا میں نیکی قائم کرنے آتے ہیں وہی ان کا ترکہ اور وہی ان کا ورثہ ہوتا ہے مال و دولت کا ورثہ نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے مخبر صادق نے فرمایا: [مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ] (صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب فَرْضِ الْخُمُسِ: 3093) ''ہم ترکہ نہیں چھوڑتے۔''

168- ﴿اٰبَآئِكَ﴾ اٰبَآءٌ۔ اَبٌّ کی جمع ہے اور وہ والد ہے مگر اُمٌّ کی طرح ابٌ کا استعمال بھی ہر ایک اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں لانے یا اصلاح یا ظہور کا باعث ہو۔ (غ) اور چچا اور باپ کو اکٹھے ابوین کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح باپ اور دادا کو بھی اور باپ اور ماں کو بھی۔ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جو یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے آباء میں شامل کیا ہے۔

﴿اِسْحٰقَ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جو حضرت سارہؓ کے بطن سے تھے۔ یہاں عبادت کا لفظ اختیار کیا ہے جو اسی عملی اصل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ عبادت خود عمل سے ہے اور اصلی عبادت جوارح کی عبادت ہی ہے۔

169- ﴿خَلَتْ﴾ جب زمانہ کے لحاظ سے خَلٰی بولا جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے مَضٰی وَ ذَهَبَ یعنی وہ گزر چکا۔ (غ) گویا دنیا

وَ قَالُوۡا کُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۳۵﴾

اور کہتے ہیں یہودی ہوجاؤ یا عیسائی تم ہدایت پالو گے، کہہ بلکہ (ہم) ابراہیم کے مذہب (پر ہیں) جو راست رو تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ (170)

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰی وَ مَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا، اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی

---

سے ان کا تعلق منقطع ہو چکا اور وہ خدا سے جا ملے۔

**انبیاءؑ سب ایک امت ہیں:**

یہاں ان سب انبیاء اور برگزیدوں کو ایک امت کہا ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی طریق کے پیرو تھے۔ گو شرائع کی فروعات میں اختلاف ہو۔ مگر یہاں چونکہ عملی اصل الاصول اسلام کا ذکر ہے اور سب انبیاء یقیناً اس اصول پر قائم تھے اس لیے ان کو ایک امت کہا ہے اور یہ کہہ کر کہ یہ امت گزر چکی بتایا ہے کہ ان کے اعمال اب تم کو فائدہ نہیں دے سکتے گو تم ان کی اولاد ہو۔

170- ﴿حَنِیۡفًا﴾ حَنِیۡفٌ۔ حَنَفٌ سے ہے جس کے معنی ہیں گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونا۔ (غ) اس کے خلاف جَنَفٌ ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔ پس حنیف وہ ہے جو استقامت کی حالت پر قائم ہے۔ نہ افراط کی طرف جھکتا ہے نہ تفریط کی طرف۔

**ملت ابراہیمی کا اعتقادی اصل:**

ملت ابراہیم کے عملی اصل الاصول کا ذکر کرنے کے بعد اب اعتقادی اصل الاصول کا ذکر کرتا ہے اور پہلے مخالفوں کا قول نقل کرتا ہے کہ یہود تو کہتے ہیں کہ اعتقادات یہود کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے اعتقادات کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم دونوں شرک کی طرف جھک گئے ہو۔ اصل الاصول ملت ابراہیمی کا یہی ہے کہ شرک سے اجتناب کلی ہو۔ پس اعتقادی رنگ میں مذہب کی بنیاد یہ قرار دی جائے گی کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص کر کے قبول کیا جائے۔

نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾

طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔(171)

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ

پس اگر وہ ایمان لائیں اس کی مثل جو تم ایمان لائے تو یقیناً انہوں نے ہدایت پائی اور اگر پھر جائیں تو وہ صرف مخالفت پر ہیں پس اللہ ہی ان کے مقابلے میں تیرے

---

171- ﴿الْاَسْبَاطِ﴾ سِبْطٌ کی جمع ہے جس کے معنی قبیلہ ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ایک آدمی کی نسل سے ہوں۔ یہ لفظ بالخصوص اولاد اسرائیل پر بولا گیا ہے کیونکہ اسرائیل کے بارہ بیٹوں میں سے ہر ایک ایک قبیلہ کا جد بنا۔

﴿نُفَرِّقُ﴾ تَفْرِيْقٌ، فَرْقٌ سے تکثیر کے لیے ہے۔ انبیاء میں تفریق نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ بعض کو مانا جائے، بعض کو نہ مانا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ سب کا مرتبہ یکساں ہے۔ کیونکہ اس کے خلاف ﴿فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾[البقرة: 253:2] ”ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔“ موجود ہے۔

﴿اَحَدٍ﴾ نفی میں لفظ اَحَدٌ جمع کا فائدہ دیتا ہے۔ اس لیے تفریق کو اَحَدٌ کی طرف منسوب کیا گیا۔

### جامعیت مذہب اسلام:

اس آیت میں نہ صرف مذہب کے اصل الاصول ایک اللہ پر ایمان کا ذکر کیا ہے بلکہ سچے اور کامل مذہب کی جامعیت کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کی غرض یہی ہے کہ یہ اصل الاصول ایک خدا پر ایمان ملت ابراہیمی کا ہی نہیں۔

### دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے:

بلکہ دنیا میں جس قدر بھی نبی ہوئے سب کے مذہب کا اصل الاصول یہی تھا۔ اس لیے ایک مسلمان سب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتا ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی اصول پر قائم تھے اور ایک ہی غرض کو پورا کرنے آئے تھے۔ یہاں اول تو چار بڑے انبیاء کا ذکر کیا۔ یعنی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام۔ پھر سب انبیائے بنی اسرائیل کا مجمل ذکر اسباط کے لفظ میں کیا۔ پھر یہود کے سب سے بڑے نبی موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا۔ پھر عیسائیوں کے نبی عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا اور ان سب کے بعد ﴿مَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ﴾ کہہ کر یہ بتا دیا کہ سلسلہ ابراہیمی یا سلسلہ موسوی کے سوائے اور بھی دنیا میں نبی ہوئے ہیں۔ ان کی بھی یہی تعلیم اصلی تھی ان کو بھی ہم انبیائے برحق مانتے ہیں۔

### ﴿مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی تفسیر:

اور یوں جو ابتدائے سورۃ میں فرمایا تھا کہ اس پر ایمان لائیں جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ اس کی تشریح خود ہی فرما دی کہ اس سے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ لیے کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔(172)

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔(173)

---

مراد وہ کلام ہے جو انبیاء پر نازل کیا گیا خواہ وہ ایک قوم کے نبی ہوں یا دوسری کے۔

172- ﴿شِقَاقٍ﴾ شِقٌّ سے ہے یعنی شگاف جو کسی چیز میں ہو ﴿شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا﴾ [عبس: 26:80] ''ہم زمین کو شق کرتے ہوئے پھاڑتے ہیں۔'' اور شِقَّةٌ اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جو الگ ہو جائے۔ اور اسی سے شِقَاقٌ بمعنی مخالفت ہے۔ گویا شِقَاقٌ میں شِقٌّ مخالف اختیار کر لی ہے اور شِقٌّ بمعنی مشقت بھی آتا ہے: ﴿اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ [النحل: 7:16] ''سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے۔''

﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ﴾ كِفَايَةٌ کے معنی ہیں مشکلات کا سد باب کر دینا اور کسی معاملہ میں مراد کو پہنچ جانا اور اس جملہ کے معنی ہیں: [كَفَاكَ اللّٰهُ شَرَّهُمْ] (تفسیر السعدی: جلد 1، صفحہ 68) یعنی اللہ ان کی شرارتوں سے بچا کر تمہیں مراد کو پہنچائے گا اور ان کی مخالفت تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

### اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا:

یہاں یہ بتایا ہے کہ ایسے صاف اور جامع مذہب پر ایمان نہ لانے والے وہی لوگ ہوں گے جو حق کے دشمن ہیں۔ کیونکہ اس مذہب کو مان لینا جو دنیا کے سارے انبیاء کو راستباز ٹھہراتا ہے عین اقتضائے عقل و انصاف ہے اور یہ مذہب کسی بزرگ کو جھوٹا اور مفتری قرار نہیں دیتا۔ اگر یہ سیدھی سیدھی بات نہ مانیں تو سمجھ لو کہ صرف حق کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں مگر ان کی مخالفت کی پروا نہ کرو۔ ان کی شرارتوں سے خدا تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے گا۔

173- ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ صِبْغَةٌ اصل میں رنگ کو کہتے ہیں۔ اور یہاں مراد دین ہے۔ کیونکہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ہوتا ہے اسی طرح مذہب کا اثر انسان پر ہوتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی فطرت کیے ہیں اور مفردات میں ہے کہ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ میں اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو انسانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے یعنی عقل جس سے بہائم سے ان کی تمیز ہوتی ہے۔ مگر تاج العروس میں صِبْغَةٌ کے معنی دین دیئے ہیں اور ہر ایک وہ راہ جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ اور قرآن شریف میں ﴿وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ﴾ [المؤمنون: 20:23] آتا ہے جہاں مراد سالن ہے اور عیسائیوں کے بپتسمہ کو یعنی جو وہ بچے کو پانی میں غوطہ دیتے ہیں صبغۃ یا اصطباغ کہا جاتا ہے۔ (غ)

### دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے:

یہاں دین الٰہی کا جس کو رنگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے لفظ صِبْغَةٌ اختیار کر کے عیسائیوں کے اصطباغ سے گویا اشارۃً مقابلہ کیا ہے

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَ ھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

کہہ، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو اور وہ ہمارا رب اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے عمل اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں اور ہم اسی کے لیے اخلاص رکھنے والے ہیں۔ (174)

---

کہ ایک طرف خدائی بپتسمہ یعنی دینِ الٰہی یا دینِ اسلام ہے جس کو لینے سے انسان کل انبیائے عالم کو راستباز قرار دیتا ہے اور دوسری طرف ایک انسانی بپتسمہ یعنی عیسائی مذہب ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ سوائے مسیح کے دنیا میں کوئی راستباز نہیں۔ یہ گویا سب کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ ایسا مذہب دنیا میں کبھی غالب نہیں ہوسکتا۔ ﴿صِبْغَۃَ اللّٰہِ﴾ میں نصب یا تو اس لیے ہے کہ یہ ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰہِ﴾ میں اٰمَنَّا کے لیے مصدر موکد ہے یا اس لیے کہ تحریص دلانے کے لیے اور بعض نے اس کو ﴿مِّلَّۃَ اِبْرٰھٖمَ﴾ سے بدل کہا ہے۔

174- **خالص اور صافی میں فرق:** ﴿مُخْلِصُوْنَ﴾ خَالِصٌ اور صَافِیْ یکساں ہیں یعنی کھوٹ وغیرہ سے پاک۔ مگر صافی ابتدا سے ہی ایسا ہے اور خالص جو بعد میں صاف ہوجائے۔ (غ) مسلمانوں کا اخلاص یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی تشبیہ سے اور نصاریٰ کی تثلیث سے بری ہیں۔ (غ) اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ﴾ [البینۃ: 5:98] گویا فرمانبرداری کو اس کے لیے خالص کرنے والے۔ یہی معنی یہاں ہیں یعنی ایمان اور اطاعت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے والے۔ اور ہر قسم کے کھوٹ اور آمیزش سے پاک رکھنے والے۔

**خدا کی ربوبیت کی وسعت:**

دنیا میں ہر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی روحانی ربوبیت کو اپنے تک محدود کرتی ہے۔ مگر اسلام اس خدا کو پیش کرتا ہے جو رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ہے یعنی ہم جو مسلمان ہیں وہ ہماری ربوبیت بھی فرماتا ہے۔ اور عیسائی اور یہودی جو مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ تمہارا بھی رب ہے۔ یہ گویا ربُّ العٰلمین کی کھلی تفسیر کر دی۔

**مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنے دشمنوں سے ہمدردی کریں:**

اور ایک مسلمان کو سمجھا دیا کہ جو تمہارے دشمن ہیں جو تمہارے دین کے مخالف ہیں ان کا رب بھی وہی خدا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان کی بھی ربوبیت فرماتا ہے اور ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے یعنی صفاتِ الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا مذہب [تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰہِ] ہے اس کے لیے بھی ضروری ہوا کہ وہ اپنے قلب میں اس قدر وسعت پیدا کرے کہ اس میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی سچی ہمدردی اور خیر خواہی موجود ہو۔ یہ نہایت ہی مشکل مقام ہے مگر رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ کی تعلیم دینے والی کتاب اسی مقام پر مسلمانوں کو پہنچانا چاہتی ہے اور یہی نقشہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اور صحابہ کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ کس طرح عملی طور پر دشمنوں سے محبت اور پیار کر کے دکھایا اور کس طرح ان کے سارے مظالم پر یکسر قلم

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے؟(175) کہہ، کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اس گواہی کو چھپا دے جو اللہ کی طرف سے ہے اس کے پاس ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

ع 16 12 16

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی ان کے لیے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہے جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے متعلق باز پرس نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے۔(176)

---

پھیر دیا ﴿ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ [البقرة: 139:2] ''ہمارے عمل ہمارے لیے اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں۔'' میں بتایا کہ اصل کامیابی تو اعمال سے ہے۔ پس تم بھی اچھے عمل کرو۔ مگر یاد رکھو کہ خالص نیکی کی راہیں صرف اسلام میں ہی ہیں۔ اور وہ قوم جس کے اعمال صرف خدا کے لیے ہوں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایمان سے عبادت اور عمل پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ ذکر بھی کر دیا۔

175- **کفارۂ مسیح اور انبیائے سابق:** قرآن کریم نے یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام دیا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ پہلے نبی یہودی یا عیسائی تھے یعنی ان خاص عقائد کے پیرو تھے جن کی تعلیم تم دیتے ہو۔ یہ واقعات پر مبنی ہے۔ آج بھی عیسائی کہتے ہیں کہ یہ پہلے انبیاء کفارہ مسیح پر ایمان لاتے تھے کیونکہ اس کے بغیر وہ نجات یافتہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اس سے بڑھ کر کیا ظلم اور کیا اخفائے شہادت ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم پر جو خدائے واحد پر ایمان اور اعمال صالحہ کا بجا لانا ہے یوں پردہ ڈالا جائے۔ یہی حالت یہود کی تھی کہ وہ بھی بوجہ انبیاء کی اولاد ہونے کے اپنے آپ کو اعمال سے مستغنی خیال کرتے تھے۔

176- ایمان صحیح سے ہی چونکہ عمل خالص پیدا ہوتا ہے اس لیے پھر دہرایا کہ گزشتہ لوگوں کے اعمال تمہارے کام نہ آئیں گے۔